

تصوف

اور

نسبت صوفیہ

مؤلفہ

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

خلیفہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ



کتب خانہ مظہری

گلشن اقبال ۷۷ کراچی

باسمہ تعالیٰ
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ابالحد کتاب تصوف وفسیت مونیابو حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب
(خلیفہ حکیم الامت تھانویؒ) کی نہایت عظیم تصنیف ہے احقر نے اس کا
مطالعہ کیا ہے یہ کتاب جلد سائلین اور طالبین کے لئے علمی اور عملی اعتبار سے
نہایت اکیسر اور مفید ہے اور اس کا مطالعہ عوام و خواص اور علمائے کرام کے
لئے بھی طمانیت قلب اور ترقی روح کا ذریعہ ہے۔

درد دل نے اور سب دردوں کا دریاں کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بین کر دیا

العارض
حکیم محمد اختر عفی اللہ تعالیٰ عنہ
۲۶ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مصلح الامت حضرت مولانا دامت برکاتہم کا ایک مضمون بعنوان تصوف اور دوسرا "نسبت صوفیہ" کے نام سے رسالہ معرفتِ حق میں شائع ہوا جس کو عام طور پر پسند کیا گیا۔ خصوصاً اہل علم حضرات ان دونوں مضامین سے نہایت محظوظ اور لطف اندوز ہوئے اور اس کی نافعیت و افادیت کا اظہار فرمایا اور بعضوں نے تو یہاں تک کہا کہ اس مضمون کو عربی میں شائع ہونا چاہیے تاکہ یہاں کے علاوہ دوسری جگہ کے لوگوں کو بھی نفع پہنچے، اور تصوف و اہل تصوف کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں، بعض مخلص اہل علم نے یہ بھی مشورہ دیا کہ ان دونوں مضامین کو یکجا کتابی شکل میں آجانا چاہیے اس سے زیادہ نفع کی امید ہے۔ اس بناء پر ان دونوں مضامین کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے خدا کرے اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ وبالله التوفیق۔

قبل ازیں کہ مضامین عالیہ کو ملاحظہ فرمائیں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لیں کہ حضرت والا دامت برکاتہم اس قسم کے مضامین اکثر و بیشتر بیان فرماتے رہے ہیں اور مختلف عنوان سے بیان فرماتے ہیں جس کے بعض حصہ کو معرفتِ حق میں

شائع کیا گیا ہے، وجہ انکار بیان کی یہ ہے کہ زمانہ انکار و عناد کا ہے بالخصوص باطنی چیزوں کے تو اکثر اہل ہوا سرے سے قائل ہی نہیں تا جمل چہ رسد، اور اپنے اس انکار پر اس امر سے تمسک کرتے ہیں کہ یہ تصوف و طریقت کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ چیزیں نہیں تھیں۔ اس لئے یہ بدعت و محدث ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یوں پہلے بھی صوفیہ پر انکار کیا گیا ہے مگر چونکہ زمانہ خیر القرون کے قریب تھا اس لئے انکار میں بھی ہند سے تجاوز نہ کرتے تھے بلکہ اکثر تائب ہو کر ان حضرات کے سلسلہ میں داخل ہوتے اور اپنی اصلاح کہہ کر باطنی دولت حاصل کرتے تھے مگر اب تو عجیب خربطہ ہے کہ ہر شخص ہی محقق بنا بیٹھا ہے جس کو ذرا بھی دین و فہم کا حصہ نہیں وہ بھی بڑے سے بڑے شخص پر انکار کرنے کے لئے تیار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس انکار کو اپنا فریضہ وقت تصور کرتا ہے اس لئے حضرت والا ایسے مضامین کو بڑے ہی شد و مد سے بیان فرماتے ہیں تاکہ حقیقت کا انکشاف ہو جائے اور عدم علم کی وجہ سے جو انکار ہے وہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ حضرت والا نے اس مضمون میں تصوف کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے نیز صوفی کی وجہ تسمیہ اور دیگر ضروری مسائل پر سیر حاصل کلام فرمایا ہے جس کو دیکھ کر ہر منصف مزاج اور سمجھدار شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ تصوف یا البغوان دیگر طریقت، شریعت اور سنت کے عین مطابق ہے بلکہ شریعت کا مغز اور لب ہے۔ اور اس کا مقصود اعلیٰ و مطلوب استی ہے، اگر کوئی شخص لفظ تسوف پر انکار کرے تو کہہ سکتا ہے اس کو محدث کہے تو کہہ سکتا ہے۔ مگر اس کے مقاصد کون شخص انکار کر سکتا ہے اس لئے کہ تسوف نام ہے تعمیر الطاہر و الباطن کا یعنی اہل تصوف کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ظاہر کو ان اعمال شرعیہ سے آراستہ

کریں جن کا تعلق ظاہر سے ہے مثلاً نماز، روزہ، وغیر ذلک، اور باطن کو ان اعمال سے آراستہ کریں جن کا تعلق باطن سے ہوتا ہے، یعنی عقائد حقہ اور اخلاقِ فاضلہ، مثلاً اخلاص۔ صبر۔ شکر، زہد، تواضع وغیرہ۔
حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشہور رسالہ انکشاف میں فرماتے ہیں کہ:-

”اور کون نہیں جانتا کہ بے شمار آیات اور بے انتہا روایات اعمال باطنی و اخلاق کی اصلاح کی فرضیت پر دال ہیں قرآن و حدیث میں زہد۔ قناعت۔ تواضع۔ اخلاص، صبر و شکر و حب الہی و دنیا بالقضاء و توکل و تسلیم وغیر ذلک کی فضیلت اور ان کی تحصیل کی تاکید اور ان کے امداد و حب دینا، حرص، تکبر و ریاء و شہوت و غضب حسد و نحو ہا کی مذمت اور ان پر وعید وارد و مذکور ہے پھر ان کے مامور بہا اور منہی عنہا ہونے میں کیا شبہ رہا اور یہی معنی ہیں اصلاح اعمال باطنی کے، یہی عمل اصلی ہے طریقت میں جس کا فرض ہونا بلا اشتباہ ثابت ہے، انتہی کلامہ
یز قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ:-

”طلب طریقت اور کمالات باطنی حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ۔ اے مسلمانو! ان چیزوں سے جو خدا کو پسند نہیں پورا پورا پرہیز کرو، یعنی کمال تقویٰ کے ساتھ ظاہر و باطن میں کوئی امر عقائد و اخلاق سے خدا تعالیٰ کی مرضی کے

خلاف نہ ہو۔ اور امر و وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ انتہی کلامہ
پس جن چیزوں کی حرمت قرآن و حدیث سے ثابت ہے ان کی اصلاح
و ازالہ واجب ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَذُرُوا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ
بَاطِنَهُ۔ یعنی ظاہری گناہوں کو جن کا تعلق جوارج سے ہے چھوڑو اور باطنی
گناہ جو اعمال قلب و صفات نفس سے ہیں ان کو بھی چھوڑو۔
نیز فقہ کی مشہور کتاب مقدمہ شامی ص ۱۰ پر ہے کہ :-

ان علم الاخلاص والعجب	یقیناً اخلاص و عجب، حسد و ریاء کا علم
والحسد والرياء فرض عين	فرض عین ہے اسی طرح اس کے علاوہ
ومثلها غيرها من افات	جو اور آفات نفوس ہیں ان کا علم بھی جیسے
النفوس كالكبور والشح والحد	کبر، بخل، کینہ، خیانت، غصہ، عداوت
والغش والغضب والعداوة	بغض، طع، بخل، بطر، خيلاء، مد اہنت
والبغضاء والطمع والبخل	استکبار عن الحق، مکر، خداع، قوت
والبطور والخيلاء والحيانة و	طول امل اور ان کے مثل دوسرے امراض
المداهنة والاستكبار عن	جن کا احياء العلوم کی ربع مہلکات میں
الحق والمكرو والمخادعة و	بیان کیا گیا ہے۔
القسوة وطول الامل ونحوها	احياء العلوم میں یہ فرمایا ہے کہ ان
مما هو بين في ربع المهلكات	امراض سے کوئی بشر خالی نہیں ہے
من الاحياء قال فيه ولا ينفك	تو لازم ہے کہ ان میں سے جن کا اپنے
عنها بشر فيلزمه ان يتعلم	کو محتاج سمجھے اس کو سیکھے اور اس
منها ما يرى نفسه محتاجا	کا انہ فرض عین ہے اور یہ ممکن نہیں ہے
اليها وازاتها فرض عين	جب تک کہ حدود و اسباب و علامات

ولا یمکن الا بہ معرفۃ حدودہا
 واسبابہا وعلاماتہا وعللہا
 فان من لا یعرف الشر لیقح
 فیہ - مقدمہ شامی منظر

دیکھئے علامہ شامی جو فقہائے متاخرین میں سے ہیں اور انہیں کی کتاب سے
 نام طوطی پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور ہم سب لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں وہ یہ فرماتے ہیں
 کہ علم اخلاق کی تحصیل فرض عین ہے اس لئے کہ ہر آدمی (الامشاء اللہ) ان مذکورہ
 امراض میں سے ایک یا اکثر یا کل میں ضروری مبتلا رہتا ہے جن کا ازالہ فرض ہے تو
 بغیر علم کے ان کی اصلاح و ازالہ کیسے متصور ہو سکتا ہے نیز بہت سے اخلاق ایسے
 ہوتے ہیں کہ جن کی تحصیل لازم ہے جیسے اخلاص و تواضع وغیرہ تو ان کا حاصل کرنا
 بھی بغیر علم ممکن نہیں اس لئے اخلاق حمیدہ اور اخلاق ستیہ کا علم ضروری ٹھہرا
 ان سب کے باوجود آج ابنائے زمانہ جو ادھر نہیں آتے ہیں بلکہ انکار تک
 کرتے ہیں تو اس کی وجہ حضرت والا دامت برکاتہم یہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر
 دین کو اختیار کرنا آسان ہے اس لئے اس کو تو اختیار کر لیتے ہیں اور باطنی اعمال
 اختیار کرنا اور اخلاق کی اصلاح کرنا چونکہ مشکل معلوم ہوتا ہے نفس کو مارنا پڑتا
 ہے اور اس سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں اس لئے باطن میں ہاتھ ہی نہیں
 لگاتے بلکہ اس کی طرف آتے ہی نہیں۔

نیز یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کام کے لئے آدمی کو عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہونے
 کی ضرورت ہے۔ دنیا کو حاصل کر لینا اور صرف ظاہری اعمال کو اختیار کر لینا عالی
 ہمتی نہیں بلکہ عالی ہمتی یہ ہے کہ تمام تعلقات غیر ضروریہ کو قطع کر کے اللہ تعالیٰ سے
 رشتہ جوڑا جائے اور نسبت مع اللہ حاصل کی جائے مگر ان لوگوں کے لئے تعلقات

کا ترک کرنا موت ہے موت ، اس لئے نہ ان کو ترک کرتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوتا ہے ، یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے تو صبر کر لیتے ہیں مگر ان علاق سے صبر نہیں ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ، فیما حسرتا داویلتا ۔ اور واقعی یہ ہر کس دنیا کس کا کام بھی نہیں ۔ ولقد صدق من قال

ہر جو ایسے ناسر لائے ترک دنیا کے کند شیر مرد باید و دریائے مردانہ نیز فرمایا کہ علماء پر جیسے یوسفیہ ہے کہ عقائد دفعہ حاصل کریں اسی طرح ان پر دوفریشہ اور بھی عائد ہوتے ہیں ۔ اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور نسبت حاصل کریں اور ثانیاً یہ کہ رذائل نفس کی اصلاح کریں اور نفس امارہ کو شریعت و سنت کا اتباع کر کے نفس مطمئنہ بنائیں اور یہی تصوف و طریقت کا مقصد ہے اور یہی اس کی غرض و غایت ہے ، مگر اب چونکہ عموماً جو لوگ سلوک میں آتے ہیں اور اپنے کو اہل تصوف کی طرف منسوب کرتے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ ان پر کچھ ایسا بھوجو طاری رہتا ہے اور کچھ ایسے کھوئے گئے ہیں کہ یا وجود آمد و شد کے صحیح مقصد کا استحضار نہیں رہتا کہ آخر ہم کو کیا کرنا ہے اور اس آمد و رفت کا مقصد اصلی کیا ہے اس وجہ سے بھی حضرت والا اکثر و بیشتر ایسے مضامین بیان فرماتے ہیں کہ آنے والوں کو بصیرت ہو اور حقیقت امر منکشف ہو کہ ان کے لئے لائحہ عمل متعین ہو جائے ، بطالت چھوڑیں اور صدق اختیار کر کے کام پر لگ جاویں تاکہ رسمی آنے جانے والوں کی وجہ سے اصلی تصوف اور اہل تصوف بدنام نہ ہوں ۔

در کسوت خاص آمدہ عامے چند بدنام کنندہ نیکو نامے چند کے مصداق نہ نہیں ۔

جب یہ بات محقق ہو گئی کہ رذائل نفس کا ازالہ اور نسبت مع اللہ کی

تعمیل ضروری ہے تو اب سمجھئے کہ اس کے لئے سب آسان صورت یہ ہے کہ اپنے کو کسی کامل مکمل کے سپرد کر دے۔

اس لئے کہ عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ یہ باطنی دولت بغیر خدمت و صحبت

اہل اللہ کے حاصل نہیں ہوتی۔

گر تو سنگ خارہ و مرمہ شومی جو بے صاحب دل رسی گوہر شومی

اہل کمال کی صحبت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا بیان حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب اخبار الایمان کے مقدمہ میں اس طرح فرمایا ہے

اما بعد فقیر حقیر اضعف بعد حمد و صلوة کے فقیر حقیر اللہ تعالیٰ و باری

عباد اللہ القوی الباری کا یہ خیف ترین بندہ عبدالحق ابن

عبدالحق ابن سیف الدین الترمذی دہلوی بخاری

البخاری معروض می گرداند کہ برابر اب

الباب واصحاب البصائر کہ زمرہ اہل

خبرت و اعتبار اند محقق و مقرر است

کہ مؤثر ترین حالات بلکہ افضل عبادت

مصاحبت اہل کمال و مجالست مقربان

در گاہ ذوالجلال است۔

زیرا کہ ہر مشاہدہ استقامت

احوال ایساں سالک را ہمت و دست

دہر کہ تحمل اعبائے عبادت و برداشت

مشاق ریاضت کہ لازم سلوک اس

طریق است آسان شود بلکہ بمعائنہ

اس لئے کہ ان حضرات کی استقامت

اور ان کے ثبات و استقلال، کو

دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایک قوت

جمالِ ایساں نورے دردِ ل
افتد کہ ظلمتِ ریب وارتیاب
کہ علتِ بُعد و حجاب است زائل
گرد۔

(اجزاء الاخیار ص ۷)

اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے جس کی
وجہ سے عبادت کا ثعب اور ریاضت
کی مشقتوں کا برداشت کرنا جو کہ
اس طریق پر چلنے کے لئے لازم ہیں
اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔
بلکہ ان حضرات کے جمال کے مشاہدہ
سے اس کے قلب میں انیک نور پیدا
ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شکوک
و شبہات کی تارکیکیاں کہ دراصل
وہی بعد اور حجاب ہوتی ہیں اس کے
قلب سے زائل ہو جاتی ہیں۔

دیکھئے یہاں حضرت شیخ محدث قدس سرہ مصاحب ت اہل کمال کو
افضل عبادات فرما رہے ہیں اور اس کی دلیل یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ان حضرات
کے ثبات و استقامت کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایسی قوت و ہمت پیدا
ہو جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے اعمال کی مشقتوں کا تحمل آسان ہو جاتا ہے اور
ان کے جمال کے مشاہدہ ایسا نور قلب میں آجاتا ہے کہ شک و شبہ کی ظلمت دور
ہو جاتی ہے اور حجاب مرتفع ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی تعبیر بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی
نور اللہ مرقدہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

بد بیشمار لوگوں کی ایک جماعت جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقل
محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اس کا ہر ایک فرد

بشر تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے، زبان قلم سے اور قلم زبان سے (یعنی تحریر اور تقریر) خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت کی وجہ سے جن کی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، عقائد اور فقہ کے سوا جن سے وہ ان کی صحبت سے پیشتر بھی بہرہ یاب تھے۔ باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمال صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ اسخ ہو گئے ہیں یہی حالت ہے جس کو کمال کہنا چاہئے اور یہی حالت بہت سے کمالات کی موجب ہے۔ (تحفۃ السالکین ص ۷۷)

قاضی صاحب رحم نے مشائخ کی صحبت سے جو فیض و نفع ہوتا ہے اس پر کتنی عمدہ اور کیسی محکم دلیل بیان فرمائی، کہ بے شمار لوگوں کی ایک جماعت (متعدد اور مختلف مقامات سے) خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت سے عقائد و فقہ کے سوا باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی ہے جو پہلے حاصل نہیں تھی۔ پھر اس جماعت کے اوصاف بیان فرمائے کہ اس کا ہر ایک فرد بشر تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے تو جب کسی جماعت کے ہر فرد کی یہ حالت ہو، پھر ظاہر ہے کہ وہ کس قدر قابل وثوق اور لائق اعتماد ہو گئی۔ اور جب ایسی جماعت حق کی لوگ کسی امر کے متعلق بالاتفاق فیصلہ کریں گے تو یقیناً موجب خیرم اور قطع ہوگا۔ گویا قاضی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ تحریر اور تقریر ہر زمانہ میں اتنے ثقہ لوگ اس امر کے قائل

ہے ہیں کہ حد توازن کو پہنچ گیا ہے اب اس کے بعد کسی کو مجال انکار نہیں۔ اور باطن میں نئی حالت جو مشائخ کی خدمت سے پیدا ہوتی ہے اس سے مراد احسان ہے جس کا ذکر حدیث جبرئیل ان تعبد الله کانک تراء میں آیا ہے میری سمجھ میں صحبت کی ضرورت و اہمیت پر اس سے زیادہ کلام کی ضرورت نہیں یوں اگر کسی کو تحصیل مطلوب ہو تو حضرت مولانا دامت برکاتہم کار سالہ فوائد الصحبۃ مطالعہ کرے، امید ہے کہ اس مختصر کلام سے ضرور کچھ بصیرت ہوگی۔ اور پیش نظر مضمون کے سمجھنے میں اعانت ہوگی۔

اب اخیر میں یہ گزارش ہے کہ جن لوگوں کو بفضلہ تعالیٰ اہل اللہ کی صحبت میسر ہو ان کو چاہئے کہ صدق نیت و حسن عقیدت کے ساتھ ان سے تعلق رکھیں اور حاصل شدہ وقت کو غنیمت شمار کر کے ان سے باطنی فیض حاصل کریں۔

باکرمیاں کار ہادشوار نیست
 اس حقیقہ کے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاق کی اصلاح کو آسان فرمائیں اور اپنی محبت و نسبت سے توازیں آمین۔

اب آپ حضرات کے سامنے حضرت مولانا دامت برکاتہم کے مضامین پیش کئے جا رہے ہیں بغور مطالعہ فرمائیں۔ مَتَّعَنَا اللہُ بِہَا وَاِیَّا کُمْ وَ سَائِرَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

یکے از خدام

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

تصوّف

حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعی فرماتے ہیں
تصوّف کی اصل | کہ تصوف کی اصل حدیث جبریل ہے جس میں
 آیا ہے کہ ما الاحسان ؟ قال ان تعبد الله کانک تراہ فان
 لم تکن تراہ فانہ یراک ۔ چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے ۔ اسی
 معلوم ہوا کہ صوفی، مقرب اور محسن کو کہتے ہیں ۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خود کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امت میں مختلف
 درجہ کے لوگ ہیں بعض ان میں سے اصحاب الیمین ہیں اور بعض کو مقربین کہا جاتا ہے
 جو شخص اپنے ایمان کو صحیح کرے اور شرعی اوامر و نواہی کے مطابق اپنا عمل رکھے تو یہ
 وہ لوگ ہیں جو کہ اصحاب الیمین کہلاتے ہیں اور ان امور کے ساتھ ساتھ جس شخص
 کی غفلت بھی کم ہوں اور نوافل و طاعات کی کثرت ہو اور اس کے قلب پر ذکر اللہ
 کا استیلاء ہو جائے اور حق تعالیٰ سے مناجات کا تسلسل اور دوام اس کو حاصل
 ہو گیا ہو ایسے شخص کو مقرب اور محسن کہتے ہیں اور اسی کو صوفی بھی کہا جاتا ہے ۔
 حضرت ابو یحییٰ زکریا کا جو قول نقل کیا گیا ہے یہاں ہم اس کو ناظرین کے افادہ
 کے لئے بعینہ درج کرتے ہیں ۔ ہذا النص ۔

وہؤلاء الموصوفون بما
 اور یہ حضرات جو صفات بالا کے ساتھ

ذکرهم المقربون المتصفون
 بالاحسان - فی الخبر الصحيح
 ما الاحسان؟ قال ان تعبد
 الله كأنك تراه فان لم تکن تراه
 فانه یراک والامة درجاتهم
 متفاوتة ینقسمون الی اصحاب
 الیمین والی المقربین کما دل
 علیہ الکتاب العزیز فمن صح
 ایمانه وعمل بما امر به شرعا
 فهو من اصحاب الیمین ومن
 قلت غفلاته وتوالت منه
 نوافله وطاعاته وتوالم
 علی قلبه ذکره ودعوتہ
 فهو المقرب والمحسن ولعیبر
 عنه بالصوفی الذی صفا
 عن الاخلاق المذمومة
 وتخلق باخلاق المحمودۃ
 حتی احبه الله تعالی وحفظه
 فی جمیع حرکاته وسکاته
 کما جاء فی الخبر ما تقرب
 المتقربون الی بشل اداء

متصف ہیں مقربین کہلاتے ہیں اور
 یہی وہ لوگ ہیں جو کہ صفت احسان
 کے ساتھ متصف ہیں چنانچہ صحیح
 حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ احسان
 کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی
 عبادت اس طرح سے کرو جیسے اس
 کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ نہ حاصل
 ہو تو یہ سمجھو ہی کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے
 امت کے لوگوں کے درجات مختلف ہیں
 بعض اصحاب الیمین کہلاتے ہیں اور بعض
 کو مقربون کہا جاتا ہے جیسا کہ خود قرآن
 حکیم میں آیا ہے لہذا جس کا ایمان درست
 ہو گیا اور اس نے مامورات شرعیہ پر
 عمل کیا وہ اصحاب الیمین کہا جاتا ہے
 اور جس کی غفلات کم ہو گئیں اور نوافل
 میں دوام اور استمرار اسکو حاصل ہو گیا
 اور اس کی طاعات کثیر ہو گئیں اور
 ذکر اللہ کا قلب پر استیلاء ہو گیا اور اپنی
 تمام حوائج میں حق تعالیٰ کی جانب رجوع
 ہونا اور اسی سے دعا کرنا جس کا حال

ما افترضت عليهم ولا يزال
العبد يتقرب الى بالنوافل
حتى احبه فاذا احبته
كنت سبعة الذي يسبح
به وبصره الذي يبصر
به = الحديث =

(حاشیہ قشیریہ ص ۷)

بن گیا وہ مقرب کہلاتا ہے۔ اور اسی شخص
کو محسن کہا جاتا ہے اور اسی کو صوفی
بھی کہتے ہیں جو کہ صفاء سے مشتق ہے
یعنی یہ شخص اخلاق مذمومہ سے پاک و
صاف ہو گیا اور اخلاق محمودہ سے متصف
ہو گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے
محبوب بنالیا اور جملہ حرکات و سکنات
میں اس کے محافظ و نگران ہو گئے۔
جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجھ سے
تقرب حاصل کرنے والوں میں سے کسی نے
اس جیسا تقرب حاصل نہیں کیا جو کہ
فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا
جاتا ہے (یہ قرب فرائض کہلاتا ہے)
اور بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب
حاصل کرتا رہتا ہے (یعنی ادائے فرض
کے بعد کیونکہ اس کے بدون نوافل
سبب قرب تو کیا ہوتے معتبر بھی نہیں)
یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا
ہوں اور جب وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے
تو پھر میں اس کا کان بنجاتا ہوں جس سے
سنتا ہے اور آنکھ بنجاتا ہوں جس سے

دیکھتا ہے (یہ قیوم نوافل کہلاتا ہے)

یعنواں دیگر اس کو یوں کہتے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے

تصوف نام رکھنے کی وجہ

بعد مسلمانوں میں سے جو لوگ کہ اپنے وقت کے افضل ہوتے تھے ان کا کوئی خاص نام بجز صحابی رسول کے نہ ہوتا تھا اس لئے کہ صحابیت سے بڑھ کر کوئی فضل و شرف ہی نہ تھا جس کی جانب ان کو منسوب کیا جاتا۔ پھر جب صحابہ کا دور ختم ہوا اور قرن ثانی آیا تو جن حضرات نے صحابہ کی صحبت پائی تھی ان کو تابعین کہا جانے لگا اور یہی اس وقت ان کے حق میں سب سے بڑی تعریف سمجھی جاتی تھی پھر ان کے بعد لوگ تبع تابعین کے لقب سے ملقب ہوتے، پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ مختلف درجات اور متبائن مراتب میں تقسیم ہو گئے تو اب اس وقت خواص ناس جن کو امور دین کا شدت سے اہتمام تھا زہاد اور عباد کے نام سے پکائے جانے لگے۔ یعنی یوں کہا جاتا تھا کہ فلاں عابد، فلاں زہاد، پھر اس کے بعد جب بدعات کا شیوع ہو گیا اور سب فرقوں میں باہم تقابل اور تناقض ہونے لگا یہاں تک کہ ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہاد ہیں، یہ دیکھ کر خواص اہل سنت نے جنہوں نے کہ اپنے لئے معیت الہیہ کو تجویز کیا اور جنہوں نے اسباب غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کی انہوں نے اپنے مسلک اور طریق خاص کے لئے اسم تصوف تجویز کیا چنانچہ اسی نام سے اس جماعت کے اکابر سن دوسو ہجری سے پہلے پہلے مشہور ہو گئے یہاں تک کہ انہیں حضرات کو صوفی کہا جاتا تھا۔

(قشیرہ ص ۵۷)

اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا نام اگرچہ بہت دنوں کے بعد زبانوں پر

آیا تاہم اس کا مصداق اسلام کے قرن اول میں بھی موجود تھا جیسا کہ صاحب

ابداع لکھتے ہیں کہ۔

ظهرت التصوف في القرون الاولى للاسلام فكان له
شان عظيم وكان المقصود منه في اول الامر تقويم
الاخلاق وتهذيب النفوس وترويضها باعمال الدين
وجذب بها اليه وجعله وجدانا لها وتعليقها بحكمه و
اسراره بالتدريج - ص ۳۲۵

فرماتے ہیں کہ تصوف جس وقت اسلام کے قرن اول میں ظاہر
ہوا تھا تو اس کے لئے ایک عظیم شان تھی (یعنی وہ ایک عظیم المرتبت چیز
تھی) اور ابتداءً اس سے مقصود تقویم اخلاق، تہذیب نفوس اور طبائع
کو اعمال کا نوگر بنانا اور ان کو اس کی جانب کھینچ کر لانا اور دین و شریعت
کو نفس کی طبیعت اور اس کا وجدان بنانا، نیز دین کے حکم و اسرار سے
تدریجاً نفس کو واقف کرانا تھا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر ہر مقصد اپنی جگہ پر نہایت ہی
صحیح، ضروری اور شریعت کے عین مطابق تھا۔ اس لئے ان سے کسی کو اختلاف
یا ان کا انکار نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن علماء ظاہر چونکہ معاملات اور اعمال جوارج
ہی سے متعلق احکام کو دین سمجھتے تھے ان حضرات نے اس جماعت پر ان کے اسرار
دین کی معرفت وغیرہ کا انکار کیا۔ اور ان کو کج رو اور ملحد کا خطاب دیا۔ ادھر یہ
بات بھی ان کے سازگار ہو گئی کہ امرا و سلاطین علماء کے محتاج تھے لہذا
صوفیاء تنہا پر گئے اور بے یار و مددگار ہو کر اور مخالفین کا خوف کر کے اپنے مسلک
کو ان سے پوشیدہ رکھنے پر مجبور ہوئے اور اس خیال سے کہ ان کے کلام کو اغیاء
نہ سمجھیں انہوں نے مخصوص رموز و اصطلاحات کو وضع کیا اور اپنے طریق میں داخل

ہونے والوں کے لئے نہایت سختی کے ساتھ پیش آئے، چنانچہ یہ حضرات بڑی شرائط کے ساتھ اور زمانہ دراز تک آزمائش کر لینے کے بعد تب کسی کو اپنے طریق میں لیتے تھے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ جو شخص ہم میں شامل ہونا چاہے اس کو پہلے اپنے طالب ہونے کا ثبوت دینا ہو گا۔ پھر اس کے بعد وہ مرید اور پھر اس کے بعد سالک ہو سکتا ہے، اور پھر سلوک کے بعد دو مال سے خالی نہیں یا تو اصل ہی ہو جائے گا اور یا نہیں تو راجع اور منقطع ہو جائے گا۔

اس تمام تر گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ یہ ان حضرات کی اعلیٰ درجہ کی دیانت تھی اور صدق و اخلاص تھا کہ ایک طویل زمانہ تک طالب کے اخلاق اور اس کے اطوار کو آزماتے تھے تاکہ یہ جان لیں کہ یہ ارادت میں بھی پکا ہے یا نہیں اور اس کی عزیمت صادق ہے یا نہیں یعنی ہمارے طریق میں اس کو خدا کی طلب اور محبت لائی ہے یا محض اس لئے داخل ہو رہا ہے کہ ہمارے یہاں گھس کر ہمارے اسرار سے واقف ہو جائے یعنی ہمارے الفاظ کو صرف چرگنے کے لئے یاد کر لے یا خفیہ بن کر اور ہم میں رہ کر ہماری باتوں کو دوسری جگہ پہنچا دے، بہر حال کامل اطمینان کے بعد کسی کو وہ اپنی جماعت میں لیتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ اس پر اعتماد کرتے تھے۔

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علمائے تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ :-

هو علم تعرف به احوال تزكية وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ
النفوس وتصفيہ الاخلاق اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے
وتعبير الظاهر والباطن احوال پہچانے جاتے ہیں جس کی غرض
لنيل السعادة الابدية ابدی سعادت کی تحصیل ہے۔
اب آپ خود غور فرمائیے کہ ان میں سے کونسی چیز غلط ہے، نفس کا تزکیہ غلط

یا اخلاق کا تصفیہ ہوا ہے، ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے، یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بے کار ہے، اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیب نفس، نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا، ان امور میں سے کوئی شے مقاصد شرع کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک شے کتاب و سنت کے عین مطابق ہے اور اللہ و رسول کے منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔ اس کے بعد بھی آپ نے یہ دیکھا کہ اس زمانہ میں بھی اور گذشتہ زمانہ میں بھی اس قدر شد و مد کے ساتھ اس کی مخالفت کی گئی تو اس کے کچھ اسباب تھے۔

تصوف کے انکار کی پہلی وجہ | سب سے بڑا سبب تو اس کا وہی ہوا کہ علمائے ظاہر ہی اسرار دین کے مخالف ہو گئے اور چونکہ امراء اور سلاطین پر ان کو تسلط حاصل تھا اس لئے ان کو ان حضرات کے خلاف کر دیا، ظاہر ہے کہ جب علماء اور سلاطین مسلمانوں کے یہ دونوں بڑے طبقے اس جماعت کے مخالف ہو گئے تو لوگوں کو ان کی جانب کیسے توجہ ہو سکتی تھی۔ خاص کر قوم صوفیہ نے جب یہ دیکھا کہ یہ دونوں طبقے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں اور ہماری باتوں کا سننا سنانا اور ان کو رواج دینا تو درکنار، خود ہمارا وجود ہی ان پر شاق ہے تو یہ حضرات گوشہ نشین ہو گئے اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ اندر اندر اپنے کام کو جاری رکھا اور ان حضرات کی مخالفتوں کے باوجود اپنے کام کو چھوڑا نہیں بلکہ طریق کو باقی رکھنے کے لئے اپنے سر اور جان کی بازی لگا دی۔ پکڑے جاتے تھے قید ہوتے تھے بلکہ بعضوں کو تو قتل تک کر دیا گیا لیکن قوم صوفیہ اس خیال کے پیش نظر کہ یہ باطن بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دین کا ایک

شعبہ ہے اور اہم شعبہ ہے جس قیمت پر بھی یہ باقی رہ سکے اس کو باقی رکھنا ہے مصائب سب سے اور طریق کو باقی رکھا۔ چنانچہ انہیں کے اخلاص کی یہ برکت تھی کہ اس قدر شدید مزاحمت اور موانع کے باوجود بھی طریق زندہ رہا اگرچہ ایک جماعت اس کا انکار بھی کرتی رہی اور اس کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی

تصوف کے انکار کی دوسری وجہ | ایک دوسری وجہ لوگوں کے انکار کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ طریق چونکہ نہایت ہی اعلیٰ تھا کیونکہ احکام ربوبیت اور آداب عبودیت پر مشتمل تھا اور مخلوق کو خالق سے ملانے کا ذریعہ تھا اس لئے شیطان پر بہت ہی شاق تھا لہذا اسے یہ کب گوارا تھا کہ بندے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کر لیں اس لئے ان کو گمراہ رکھنے کے لئے اس نے ایک طرف تو یہ کیا کہ بہت سے قلوب میں اس کا انکار مرتیں کر دیا اور دوسری جانب یہ کیا کہ بہت سے مدعیانِ طریق بھی ایسے پیدا کر دیئے کہ جو طریق کا زبان سے نام تو لیتے تھے لیکن اصل طریق سے انہیں اصلاً مس نہ تھا۔

بلاشبہ بہت بڑی گمراہی اس طبقہ سے بھی پھیلی۔ یعنی اس بزرگوں کے نام پر اپنے ہوی و نفس کی پیروی کی اور طریق کو بدنام کیا۔ اب اگر منکرینِ طریق اسی کو اپنے انکار کا منشاء قرار دیں اور ان کے طریق کے نام پر بہت سے خلافِ شرع امور کا ارتکاب کیا تو اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے، سالکین کی کوتاہیوں اور بعض اہلِ ظریق کی بے راہ رویوں کو لے کر اصل طریق ہی کا انکار کر دینا نہایت ہی عناد اور بعید از انصاف ہے کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اچھا تصوف کو جانے دیجئے اور اس کی جگہ اسلام کو

لے لیجئے اس کا جو نقشہ آج مسلمانوں کے عمل سے آپ کی نظروں میں کھینچتا ہے کیا وہی حقیقی اسلام ہے؟ اگر نہیں تو کیا ان لوگوں کے غیر اسلامی ائمہ اختیار کر لینے کی وجہ اصل اسلام کا انکار کیا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر تصوف ہی کا کیوں انکار؟ اور اس میں اور اسلام میں کونسا امر فارق ہے؟
غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو علم اصطلاح

شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعمیر الخلق یا اثر الباطن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایک بانظم اور با اصول چیز ہے اس میں سریدین کے لئے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لئے بھی اصول و آداب موجود ہیں جن کی غایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب کہنا بجا ہے، اور جب ان آداب و شرائط ہی کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دیدیا جائے تو پھر تو وہ طریق ہی نہیں جو کہ ہمارا موضوع بحث ہے اس لئے ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بنا پر جوڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے تو اس میں ایک تصوف ہی تو متفقہ نہیں ہے نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں اور آپ کا ان سے تعلق بھی ہے جو کہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں، منصف کے لئے یہ کافی ہے اور دلائل کی بحث از بس طویل ہے۔

اسم تصوف اگر بدعت ہو تو اس کا مسمیٰ بدعت نہیں | میں کہتا ہوں کہ

اس کا اسم اگر بدعت ہے تو مسمیٰ تو اس کا بدعت نہیں آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے، علم الاخلاص اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو

اس کو محسن، مقرب، متقی اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان اور محسن اور متقی اور مخلص کے ذکر سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات میں فرماتے ہیں کہ:-

و معظم ما دعت الی اقامته الرسول امور ثلثة - تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازاة وغیرها وتکفل بہذا الفن اهل الاصول من علماء الامة شکر اللہ مساعیہم وتصحیح العمل فی الطاعات المقربة والارتقاات الضرورية علی وفق السنة وتکفل بہذا الفن فقهاء الامة فہدی اللہ بہم کثیرین واقام بہم فوقة عوجاء اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے احسان کا بیان کیا ہے اور آیات و حدیث سے اس کو مبرہن فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

وتصحیح الاخلاص والا حسان الذین هما اصل الدین الحنیفی الذی ارتضاہ اللہ لعبادہ قال تبارک وتعالیٰ
ما امروا الا ليعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوة ویؤتوا الزکوة وذلك دین القيمة -

ما وقال ان المتقین فی جنات و عیون اخذین ما اشہم ربہم انہم کانا قیل ذلک محسنین کانا قلیلا من اللیل ما یمہجون وبالا سحارہم لیستغفرون و فی اموالہم حق للسائل والمحروم و فی الارض آیات للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون ۛ

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما الاعمال بالنيات
وقال في جواب جبريل الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم
تكن تراه فانه يراك -

یہاں تک تو مقاصد ثلاثہ کا بیان فرمایا اب آگے ان کے مراتب اور احسان
کی ان سب پر ترجیح کا بیان اس عنوان سے فرما رہے ہیں کہ :-

وَالَّذِي لَفْظِي بِيَدِهِ هَذَا الثَّالِثُ اَدَقُّ الْمَقَاصِدِ الشَّرْعِيَّةِ
مَا خُذَ اَوْ اَعْمَقُهَا مُحْتَدًا بِالنِّسْبَةِ اِلَى نَسَائِطِ الشَّرَائِعِ وَبِمَنْزِلَةِ الرُّوحِ
مِنَ الْجَسَدِ وَبِمَنْزِلَةِ الْمَعْنَى مِنَ اللَّفْظِ وَتُكْفَلُ بِهَا الصُّوفِيَّةُ رِضْوَانُ
اللَّهِ عَلَيْهِمْ فَاهْتَدُوا وَهْدُوا وَاسْتَقُوا وَاسْقُوا وَفَارُوا بِالسَّعَادَةِ
الْقُصْوَى وَحَازُوا السَّهْمَ الْاَعْلَى - (تفهيمات الهييه ص ۱۴۱)

دیکھتے حضرت شاہ صاحب فرما رہے ہیں کہ اخلاص و احسان ایسی چیز ہے
کہ علوم و اعمال کی اس کے بغیر کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی اور اسی مضمون کو
ملا علی قاری نے اپنی کتاب مرقاہ شرح مشکوٰۃ میں بیان کیا ہے۔ احسان کے
معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

قِيلَ ارَادَ بِهِ الْاِخْلَاصَ فَاِنَّهُ شَرْطُ فِي صِحَّةِ الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ
لَا نَ مِنْ تَلَفُظٍ بِالْكَلِمَةِ وَجَاءَ بِالْعَمَلِ مِنْ غَيْرِ نِيَّةِ الْاِخْلَاصِ لَمْ
يَكُنْ اِيْمَانُهُ صَحِيحًا -

اس سے معلوم ہوا کہ احسان مراد ہے اخلاص کے، بغیر اس کے اسلام
اور ایمان دونوں صحیح نہیں ہوتے، اور عمل کی قبولیت بھی اسی پر منحصر ہے اس کے
بغیر علوم و اعمال کی کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ اعمال کے اعتبار سے
تو حضرت شاہ صاحب رحمہ نے یہ فرمایا کہ بدون اخلاص کے وہ جسم بلا روح کے

رہ جاتا ہے یعنی مردہ اور علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ وہ گویا الفاظ بلا معنی رہ جاتے ہیں یعنی بالکل مہمل۔ پس کسی چیز میں اخلاص کے شامل نہ ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ضرر ہوگا کہ وہ بالکل ہی مہمل اور مردہ سمجھی جائے۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احسان پر کتنا زور دار کلام فرمایا ہے اور اس کے محصلین کی کتنی مدح فرمائی ہے یعنی اس مقصد کو سب مقاصد زیادہ اغرض اور ادا فرمایا ہے اس لئے کہ یہ سب کی روح اور باطن ہے اور جو چیز ایسی ہوتی ہے وہ ادا ہوتی ہی ہے، میرے خیال میں تصوف (یعنی احسان) کی ضرورت پر اس سے بڑھ کر کسی اور عنوان سے کلام نہیں کیا جاسکتا یعنی جس طرح سے فقہ ظاہری کو دیگر علوم و فنون کے مقابلے میں ادا و اعمق و اغرض سمجھا جاتا ہے اسی طرح سے شاہ صاحب فقہ باطن یعنی احسان و اخلاص کو بھی ادا و اغرض فرمایا ہے۔

اور سنیئے :-

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب اشعۃ المعانی میں فرماتے ہیں کہ در احسان اشارت باصل تصوف کہ عبارت از صدق توجہ الی اللہ است و جمیع معنی تصوف کہ مشائخ طریقت بااشارہ کردہ اند راجع بہ ہمیں معنی اند نیز حیات شیخ عبدالحق میں ہے کہ ان کے والد ماجد نے ہدایت کی تھی کہ نہ ملائے خشک و نامہوار نباشی، چنانچہ عمر بھر ان کے ایک ہاتھ میں جام شریعت رہا اور دوسرے میں سندان عشق، عشق الہی کی لگن تو ان کا خاندانی ورثہ تھی شیخ سیف الدین نے ان میں عشق حقیقی کے وہ جذبات چھونک دیئے تھے جو آخر عمر تک ان کے قلب و جگر کو گرماتے رہے۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۸)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اصلی تصوف کو بہت سراہا ہے اور صوفیہ صافیہ کی عظمت اور جلالت شان کو نہایت عمدہ عنوان سے بیان فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

اصل عنوان صوفیہ مرتبہ عظیم حضرات صوفیہ کا اصل عنوان عظیم المرتبہ
و مقام رفیع و مسلک طریق مستقیم است اور رفیع المنزلت ہے اور ان حضرات کا
(حیات شیخ دہلویؒ ص ۲۹۵) مسلک صراط مستقیم ہے۔
صاحب حیات شیخ دہلویؒ تحریر کرتے ہیں کہ :-

”حضرات صوفیہ مقتبسان النوار سنت اور مکاشفان سر حقیقت ہیں“
انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قرآن و حدیث کے بعد سب سے زیادہ عزت و احترام کے قابل ہے اس لئے کہ اس کا ایک ایک حرف اس ذہن کی پیداوار ہے جس پر قرآن و حدیث کا رنگ خوب رچ چکا تھا۔ یعنی حضرات صوفیہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتاب و سنت کے بعد سب سے زیادہ مستند ہے کیونکہ یہ حضرات مزاج شناس تھے شرع کے، اس لئے کتاب و سنت کے خلاف ہرگز ہرگز لب کشائی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ :-

اگرچہ علم حدیث و تفسیر بالذات برہمہ علم حدیث اور علم تفسیر اگرچہ تمام دیگر
مقدم است اما در حقیقت تصوف علوم پر اپنی ذات کے اعتبار سے مقدم
تفسیر کتاب خدا و شرح سنت رسول د ہے تاہم تصوف بھی کتاب اللہ ہی
مدلول و نتیجہ آہنا است کی تفسیر اور حدیث رسول کی شرح
اور اس کا مدلول اور نتیجہ ہی ہے (اس
سے الگ اور اس کے مقابل کوئی چیز
نہیں ہے)

شریعت اور طریقت میں فرق کرنا گمراہی کی دلیل ہے جو لوگ شریعت پر عامل نہیں وہ صوفیاء کہلانے کے مستحق نہیں۔ انہیں باطنیہ یا خشتیہ کہنا چاہیئے
(حیاتِ شیخ ص ۲۹۵)

اور سنئے :-

اسی مضمون کو علامہ شامیؒ نے بھی بیان فرمایا ہے کہ شریعت، طریقت اور حقیقت میں باہم تلازم ہے چنانچہ مشائخ فرماتے ہیں کہ :-

الطريقة سلوك طريق الشريعة والشريعة اعمال شرعية
معدودة وهما والحقيقة ثلاثة متلازمة لان الطريق
الى الله تعالى ظاهر وباطن فظاهرها الطريقة والشريعة
وباطنها الحقيقة فبطون الحقيقة في الشريعة كبطون
الزبد في لبنه لا يظفر بزيد بدون مخضه والمراد من
الثلاثة اقامة العبودية على الوجه المراد من العبد۔

(شامی ص ۴۲ ج ۱)

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے بھی اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

مکاتیب میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

”فی الواقع شریعت فرض اور مقصدِ اصلی ہے، طریقت بھی شریعت

باطنی ہے اور حقیقت و معرفت متمم شریعت ہیں، اتباع شریعت

بجمال بدون معرفت نہیں ہو سکتا۔“ (مکاتیب رشیدیہ ص ۲۴)

حضرت گنگوہیؒ نے یہ جو فرمایا کہ اتباع شریعت بجمال بدون معرفت کے

نہیں ہو سکتا۔ تو اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں وہ یہ کہ حدیث شریف

میں آیا ہے کہ :- استزھوا من البول فان عامة عذاب القبر منه

اس میں ترک استنزاہ اور عذاب قبر میں باہم مناسبت ظاہر نہیں ہے یعنی کہ پیشاب سے احتیاط نہ کی جائے تو اس کی وجہ سے عذاب قبر ہوگا۔ اس خاص سنرا کو اس جرم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ تو سنیں اس کے متعلق حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ فرماتے ہیں کہ بحر الرائق میں ہے کہ:-

وجہ مناسبتہ عذاب القبر مع ترك استنزاہ ابول هو ان القبر اول منازل الاخرة والاستنزاہ اول منزل من منازل الطهارة والصلوة اول ما يحاسب به المرء يوم القيامة وكانت الطهارة اول ما يعذب بتركها في اول منزل من منازل الاخرة۔

پیشاب وغیرہ سے عدم احتیاط میں اور اس پر عذاب قبر کے ہونے میں مناسبت یہ ہے کہ قبر آخرت کی سب سے پہلی منزل ہے اور تنزہ طہارت کی سب سے پہلی منزل ہے (اور طہارت نماز کا مقدمہ اور اس کی شرط اولین ہے) اور نماز سب سے پہلا وہ عمل ہے جن پر قیامت میں پرسش ہوگی (روزِ محشر کے جال گداز بود۔ اولیں پرسش نماز بود) تو چونکہ طہارت جس کے لئے تنزہ شرط ہے یہ پہلی منزل ہے اس لئے پہلی منزل میں پہلی چیز کے ترک پر عذاب یا

(بحر الرائق ص ۱۲) جاتا ہے۔

سبحان اللہ کیا خوب محکمہ ہے اور کیا اسرار شریعت ہیں، طہارت اور نجاست کا دخل اور اس کا اول منزل ہونا اور اس کا ربط اول منزل آخرت کے ساتھ، یہ ہیں علمائے شریعت اور یہ ہیں اسرار شریعت۔ پس حضرت گنگوہیؒ کا یہ ارشاد کہ کامل اتباع شرع بدون معرفت کے نہیں ہو سکتا۔ بجا ارشاد ہے۔ اور شفاء العلیل یہی کہ کامل مطلق فی الواقع وہ ہے جو علم ظاہر و باطن دونوں

کا جامع ہو، ورنہ نقصان سے خالی نہیں۔ عالم ظاہر تحصیل نسبت باطن کا محتاج ہے اور باطنی نسبت والا کتاب و سنت کے حاصل کرنے کا حاجت مند ہے تاجامع النورین و مجمع البحرین اور یادگار اولیاء سابقین اور وارث الانبیاء و المرسلین ہوگا اس کے متعلق حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ نہ

من تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق و من تفقہ ولم

یتصوف فقد تقشف و من جمع بینهما فقد تحقق

یعنی جو صوفی ہوا اور فقر نہ حاصل کی پس بلاشبہ زندق ہو (یعنی ٹھٹھٹ

کافر) اور جو کوئی فقیر ہوا اور تصوف نہ حاصل کیا پس بلاشبہ زائد

خشک اور پھیکا سچا کا ملا ہے اور جس نے دونوں کو جمع کیا (یعنی)

تصوف اور فقر کو) پس بلاشبہ محقق ہوا،

دیکھئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ، صاحب مرقات، شیخ عبدالحی محمد

دہلوی رحمہ، علامہ شامی، حضرت گنگوہی رحمہ غرض سارے ہی محققین ایک بات

فرماتے ہیں۔ یعنی تصوف کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو یہ سبھی حضرات اپنے

اپنے وقت میں نہایت شد و مد کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ

اللہ علیہ کے کلام میں بھی آپ نے اس کا ذکر ملاحظہ فرمایا۔ اور انہیں لفظوں میں (یعنی

تصوف کے عنوان سے) ملاحظہ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں بھی یہ لفظ

موجود تھا۔

اور سنئے۔ علامہ شاطبی رحمہ اپنی کتاب الاعتصام میں فرماتے ہیں کہ

الطریق مبنی علی الاخلاص التام بالتوجہ الصادق و

تجوید التوحید عن الالتفات الی الاعیاء۔

یعنی طریق کی بناءً اخلاص تام، توجہ صادق اور الالتفات الی الاعیاء سے توحید

کو مجرد کرنے پر ہے۔ یہ کتاب تحقیق بدعت میں ایک معرکہ الراء تصنیف ہے جس میں صوفیائے کرام کے اصل مسلک کو بتایا گیا ہے لہذا اس پر کسی کو کلام کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

دیکھئے صوفیائے کرام کا اصل مسلک اخلاص تام، توجہ صادق اور التفات الی الاغیار کے ترک کو فرمایا ہے، غور فرمائیے کہ ان میں سے کونسی سیرت قبیح ہے پھر خود ہی اس کا فیصلہ کیجئے کہ جو فن ان پاکیزہ اور شریف امور پر مشتمل ہو اس کی کیونکر مذمت کی جاسکتی ہے۔ سیرت ہوتی ہے کہ یہ حضرات تو خود فرماتے ہیں کہ ہمارا طریق ہی توحید کو التفات عن الغیر سے تجرید پر مبنی ہے جیسا کہ حضرت حاجی صاحب رح فرماتے ہیں ۛ

آسکے غیر مرے خانہ دل میں کیسے کہ خیال رنج دلدار ہے درباں اپنا
لیکن انہیں کے فن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ التصوف من اقوی
الاسباب لوقوع المسلمين فی الجہل بدینہم و بعد ہم
عن التوحید الخالص الذی ہو اسس النجاة و مدار
صحة الاعمال۔

اب جو جماعت یہ کہہ رہی ہو کہ اس کا مقصد ہی توحید خالص ہے
اسی کو اس کا مخالف قرار دیا جاتے کس قدر عجیب بات ہے اب اس
کا منشاء جہل قرار دیا جائے یا کچھ اور۔
بہر حال ۛ

وان كنت لا تدري فتلك مصيبة

وان كنت تدري فالمصيبة اعظم

علماء اور مشائخ کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ طریقت

شریعت کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی روح اور مغز ہے۔
عام طور پر تو یہ مشہور ہے کہ طریق میں رذائل اور ہوائے نفس سے بحث کی
جاتی ہے یعنی ایسے طریقے بتائے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ انسان ہوائے
نفس سے چھوٹ جائے اور اس میں اخلاص پیدا ہو جائے لیکن علامہ شاطبیؒ
اپنی کتاب الاعتصام میں وضع شریعت کی بھی یہی غرض و غایت فرماتے ہیں
چنانچہ لکھتے ہیں کہ :-

الشریعة موضوعة لاجراء المکلف عن داعية هو الله حتى
یکون عبد الله -

یعنی شریعت کی وضع اس لئے ہوئی ہے کہ مکلف کو اس کی خواہش
نفس کے داعیہ سے نکالا جائے اور صحیح معنوں میں اس کو عبد اللہ (اللہ
کابندہ) بنا دیا جائے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان میں بالعموم داعیہ نفس و ہویا موجود ہوتا ہے
اور پھر وہ ان کا ازالہ داعیہ شریعت کے ذریعہ کرتا ہے یعنی شریعت کا داعیہ ہویا
کے داعیہ پر مستولی ہو جاتا ہے اور اس کا بزور و بقہر اخراج کر دیتا ہے جس کی
وجہ سے انسان نفس کے داعیہ سے چھوٹ کر نص کے داعیہ پر چلنے لگتا ہے
اس لئے عبد اللہ ہو جاتا ہے کیونکہ احکام خداوندی پر چلنے کا داعیہ جس پر
غالب ہو وہی عبد اللہ ہے۔

اس موقع پر وہ آیت یاد آتی ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے
بلقیس کے قاصد کو جب کہ وہ ہدایا لے کر آیا تھا مخاطب کر کے فرمایا تھا۔
ارجع الیہم فلناتینہم بحتود لا قبل لہم بہا ولنخرجنہم
منہا اذلة وھم صاغرون۔ یعنی تم ان لوگوں کے پاس لوٹ

جاؤ سو ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں اس کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذیل کر کے نکال دیں گے اور وہ ماتحت ہو جائیں گے یعنی جس طرح ملوک اپنے مخالفین و مقابلین کو بزرگ شیر اور بیلریت شکر کثیر دفع کرتے ہیں اور ان کو ان کی سلطنت سے نہایت ہی ذلت اور اہانت کے ساتھ نکال باہر کرتے ہیں، اسی طرح جب حق تعالیٰ کا داعیہ قلب میں پیدا ہو جاتا ہے تو جتنے دوسرے داعی ہوتے ہیں ان سب پر وہ غالب و مستولی ہو جاتا ہے اور ان کو بیخوبی سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ کے داعیہ میں صد لشکر اور آہنی شمشیر کی قوت ہوتی ہے اس کے سامنے نہ ہی داعیہ بھی خواہ نفس و ہویٰ کا ہو یا شیطان کا۔ شک نہیں سکتا بلکہ سب کے سب ہباء منثورا ہو جاتے ہیں۔

صحبت کی ضرورت | اب یہ سمجھئے کہ شریعت پر چلنے کے لئے ضرورت تو صرف محرک یعنی صحیح داعیہ پیدا ہونے کی ہے جو کہ کسی کے اندر اگر از خود پیدا ہو جاتے تو فہما مقصود حاصل ہے لیکن عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ جن حضرات پر یہ داعیہ غالب ہو چکا ہوتا ہے اور وہ اپنی ہویٰ کے داعیہ سے خلاصی پا چکے ہوتے ہیں انہیں کی صحبت سے دوسروں میں یہ داعیہ جلد یا بدیر آسانی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ علمائے اسی لئے مشائخ کی صحبت کو حصولِ دین کے حق میں استطاعتِ میسر میں سے شمار کیا ہے۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ القولی الجلیل میں فرماتے ہیں کہ

ولیکن لہ وقت یجلس فیہ مع الناس متوجھا الیہم یلقی علیہم السکینۃ فان حجة اللہ تعالیٰ لا تتم الا بالاستطاعة
الممكنۃ ثم الاستطاعة المیسرة ومن الثانیۃ الصحبة

والحث علی الاشغال قولاً وفعلًا وتصرفاً بالقلب واللہ

اعلم والیہ الاشارة فی قوله تعالیٰ ویزکیہم ۛ

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے کے لئے قلب میں اتباع شریعت کا داعیہ پیدا کرنا ضروری ہے اور اس میں جو چیز مزامم ہے یعنی انسان کی ہوئی اور اس کا نفس اس سے خلاصی لازم ہے چونکہ اس کا ذریعہ صحبت ہے اس لئے مقدمۃ الواجب واجب کے قاعدے سے اس کا ضروری ہونا بھی ثابت ہو گیا اور حق تعالیٰ شانہ کے ارشاد ویزکیہم سے اس کا اشارہ نکلتا ہے۔

اب آپسے پوچھتا ہوں کہ جب ترتیب یوں مٹھری کہ اتباع شریعت فرض اور اس کے لئے داعیہ اتباع لازم اور مشایخ کی صحبت اس کی تحصیل کا آسان ذریعہ۔ تو پھر اب طریق کی نامشروعیت اور اس کا اجمال کہاں سے لازم آیا۔ دین کامل کی تحصیل کے لئے مشایخ اہل حق کی صحبت اور ان کی تربیت اور تزکیہ ناگزیر ہے۔ اور یہ مقصد محض مطالعہ کتب سے حاصل نہیں ہو سکتا اگر لیسا ہوتا تو افضل الکتاب یعنی کلام اللہ تنہا نازل فرما دیا جا رہی یا رسول کی خات ہی نہ پڑتی۔ لیکن جب تو کتاب اللہ کے ساتھ رسول کو بھی لیا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ رشد و ہدایت کے باب میں تنہا کتاب کافی نہیں۔ افسوس ہوتا ہے کہ اس راز کو بہت سے انگریزی دانوں نے سمجھا لیکن ہمارے سمجھ میں نہیں آیا۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں کہ

نہ عطلوں نے نہ کتابوں نے زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا آج کتاب، وعظ، اور زر سمجھی کو حصول دین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اگر انکار ہے تو بزرگوں کی نظر کا۔ حالانکہ اسی کا نام تزکیہ تھا جس کے متعلق

نص کا اشارہ بیان ہوا۔ اور سنئے یہ
امام ابوالقاسم قشیری اپنی مشہور کتاب رسالہ قشیریہ میں ضرورت
شیخ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

ثم يجب على المريد ان يتأدب بشيخ فان لم يكن له
استاذ لا يفلح ابدا هذا ابو يزيد يقول من لم يكن
له استاذ فاما له الشيطان وسمعت الاستاذ
ابا علي الدقاق يقول الشجرة اذا بنيت بنفسها
من غير غارس فانها تورق لكن لا تثمر كذا لك المريد
اذا لم يكن له استاذ ياخذ منه طريقته نفسا فنفسا
فهو عابد هو اه لا يجد نفاذا - (قشيريہ ص ۱۹۹)
مہر مرید پر واجب ہے کہ کسی شیخ سے ادب (یعنی تعلیم و تربیت)
حاصل کرے اگر اس کا کوئی شیخ نہ ہوگا تو وہ کبھی فلاح نہ پائے گا۔
یہ حضرت ابو زید فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی شیخ نہیں تو اس کا رہبر
شیطان ہے (یعنی اسی کے کہے پر وہ چلے گا) میں نے اپنے استاذ
ابو علی دقاق کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو درخت خود رو ہوتا ہے وہ
پتے تو لاتا ہے لیکن پھل نہیں دیتا ہے اسی طرح مرید کا بھی حال
ہے یعنی جب اس کے لئے کوئی شیخ نہ ہوگا جس سے کہ وہ طریق
شیئاً فشیئاً حاصل کرے تو وہ اپنی خواہش ہی کا بندہ رہیگا اس
اس کو خلاصی نہیں ہو سکتی۔

اسی کتاب القول الجمیل میں ایک دوسرے مقام پر ضرورت شیخ
کے بارے میں شاہ صاحب رح ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

«والشرط الخامس ان يكون صاحب المشايخ وتأديب
 بهم دهرًا طويلا واخذ منهم النور الباطن والسكينة
 وهذا ان سنة الله جرت بان الرجل لا يفلح الا اذا
 رأى المفلحين كما ان الرجل لا يتعلم الا بصحبة العلماء
 وعلى هذا القياس غير ذلك من الصناعات»

(القول الجليل ص ۲۱)

یعنی پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشدین کا ملین کی صحبت
 میں رہا ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانہ دراز تک اور ان سے
 باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہی صحبت کا ملین اس
 واسطے مشروط ہوئی کہ عادت الہیوں جاری ہوئی ہے کہ مراد نہیں ملتی
 حجت تک کسی مراد پانے والے کو نہ دیکھے جیسے علم انسان کو نہیں
 حاصل ہوتا مگر علماء کی صحبت سے اسی قیاس پر ہیں اور بیشک
 جیسے آہنگری بدون صحبت آہنگر یا بخاری بدون صحبت بخاری
 نہیں آتی۔

(فائدہ :- مولانا نے ارشاد کیا ہے کہ جبریاں سنت اللہ کا بھید یہ
 ہے کہ انسان اس نہج پر مخلوق ہوا ہے کہ یہ اپنے کمالات کو حاصل نہیں کر سکتا
 بدون اپنے ابنائے جنس کی مشارکت اور معاونت کے بخلاف اور حیوانات
 کے کہ ان کے کمالات پیدا کنشی ہیں اور کسی نہایت کمتر ہیں چنانچہ تیرنا حیوانات
 میں پیدا کنشی کمال ہے اور انسان کو بدون سیکھے نہیں آتا)

بیعت کی غرض و غایت اور مشیخت کے شرائط

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب خلع المرشد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کا کلام بھی نقل کر دوں جو طریقت کی ضرورت، بیعت کی حقیقت اور شرائط مشیخت وغیرہ پر مشتمل ہے اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا جس قدر صحیح نقشہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں بیان فرمایا ہے کم لوگ اس طرح بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں اپنے اس مختصر سے رسالہ در سالہ بیعت میں لکھتے ہیں کہ مد اما بیعت شریعت پس حقیقتش آنکہ مرد عامی کی عمر را در غفلت و معاصیت گذارده ہر گاہ بریں خیال متنبہ می شود و دامت می کشد و رجوع بر آں تقویٰ و طاعت می خواہد حصول این معنی بدون مشیخت عالم متقی بر ظاہر و باطن خود در عادت منتظم نمی تواند شد چه دیدن کتابہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است بیمار را بدون حصول ملکہ طب و معالجہ باین قدر اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار است۔

بہر حال بیعت شریعت پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عامی شخص جس نے کہ اپنی عمر کو غفلت اور معصیت کے کاموں میں صرف کیا ہو جب اس کو اپنے اس حال پر تنبیہ ہو یعنی اس کے دل میں کچھ کا خیال آئے اور (حالات گذشتہ پر) وہ نادام ہو کر تقویٰ اور طاعت کے کاموں کی جانب رجوع کرنا چاہے تو یہ چیز بدون کسی عالم کے جو ظاہر و باطن متقی ہو کر اپنے اوپر حاکم بنائے ہوئے یونہی بطور خود عادۃً و قویٰ پذیر نہیں ہو سکتی کیونکہ شریعت کی

کتابوں کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ
کسی طب کی کتاب کی مراجعت کی جائے
(اور یہ سب جانتے ہیں کہ) بیمار کے لئے
بغیر اس کے کہ طب اور معالجہ میں اس
ملکہ اور مہارت حاصل ہو محض کتب
بنی کے ذریعہ سے اصلاح کر لینا
اور مرض کا دفع کرنا بہت دشوار ہے

پھر آگے اس کے بعد انتخاب شیخ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ
اور اسی طرح سے ہر عالم کے قول پر عمل
کر لینا تجیر اور تشدد کا سبب ہے۔
کیونکہ ہر عالم بھی تو صحیح الفکر اور صحیح
الحواس نہیں ہوا کرتا۔ لہذا اس ضرورت
کے تحت کسی کو اپنا شیخ اور مصلح بنانے
کے لئے ایسے کسی شخص کا انتخاب
کرنا چاہئے جو کہ علاوہ علم و تقویٰ
کے دوا اور اوصاف سے متصف ہو
ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کے باب میں تساہل اور مدد ہمت کو روا
نہ رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ طالب کے
مناسب حال سہل اور افضل جو امور
ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو۔ پس

وہچنین بقول ہر عالم عمل کر دن موجب
تجراست کہ ہر یکے صحیح الفکر و الحواس بھی
باشد پس بنا بر این ضرورت مرے
سا کہ با وجود علم و تقویٰ دو صفت داشتہ
باشد یکے عدم مسابلت و مدد ہمت
در مقام امر بالمعروف و نہی عن المنکر
دوم شناختن آنچه بحال طالب افضل
و اسہل است پس این چنین کسی را
اختیار کند و زمام امور خود را بدست او
سپارد و متابعت او بر خود لازم گیرد
تا امر او خود رسد و ثمرہ این رسیدن
است بہ نجات کلی و حقیقی و دخول او
در جناب العلی و تحصیل رضائے مولیٰ

(رسالہ بیعت ص ۳۸)

ایسے شخص کا انتخاب کر کے اپنے تمام
امور کی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے
اور اس کی اتباع کو اپنے اوپر لازم کر دینے
تاکہ اپنی مراد کو پہنچے اور اس کا ثمرہ اور تعجب
آخرت میں نجات کلی ہے اور اللہ تعالیٰ
کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی
رضا کا حصول ہے۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحب رحم نے یہاں یہ فرمایا کہ بیعت کا حاصل یہ ہے
کہ انسان غفلت اور معصیت سے نکل کر تقویٰ اور طاعت کی زندگی بسر کرنے
لگے۔ اور اس کے لئے کسی عالم متقی جو کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب
میں ماہرین اور متساہل نہ ہو، نیز طالب کے حال کے لئے جو چیزیں افضل و اسہل
ہوں ان سے واقف ہو ایسے شیخ کو اپنے اوپر حاکم بنالے اور باب اصلاح میں
اس کی اتباع کو لازم کر لے۔

غور کیجئے کہ ان ائمہ میں سے کوئی چیز محل اشکال ہے۔ ظاہر ہے کہ
غفلت کا ترک کرنا ضروری ہے اور معصیت کا بھی اور یہ بھی معلوم ہے کہ خود
انسان اس معاملہ میں اپنا علاج کرنے سے قاصر ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے
کہ کسی شیخ کا مل کو اپنے اوپر اختیار کلی دیدے اور اصلاح نفس کے بارے
میں بلاچون و چرا اس کا اتباع کرے اس لئے کہ جس چیز کو خود نہیں سمجھتا اگر دوسرے
کے سمجھانے میں بھی میسر نہ نکالے گا تو پھر اس کی اصلاح ہو چکی۔ آپ خود دیکھئے
کہ استاد بچہ سے کہتا ہے کہ کہو الف۔ اب اگر اس نے اتباع کر لی تو اس کے
پڑھ لینے کی امید کی جا سکتی ہے اور جو مزاحمت شروع کر دی یعنی یوں کہا کہ کیا

دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو اس کے پڑھنے کی کوئی سبیل نہیں یہ جاہل ہی رہ جائے گا۔ یہی مطلب ہے اس کا جو صاحب الابداع نے لکھا ہے کہ: ثم انهم جعلوا للشيخ سلطة خاصة على مریدہ حتی قالوا يجب ان يكون المرید مع الشيخ كالمرتبة بين يدي الخاسل لان الشيخ يعرف امراضه النفسية وعلاجهما فاذا ابهر له مناقشة ومطالبة الدليل تنعسر معالجهته او تتعذر فلا بد من التسليم له في كل شئ من غير منازعة وقالوا ان الوصول الى العرفان المطلق لا يكون الا بهذا۔

(الابداع ص ۳۲۵)

پھر اہل طریق نے شیخ کو ایک خاص مرتبہ دیا ہے یعنی مرید پر اس کو تسلط کامل دیا یہاں تک کہ یہ فرمایا ہے کہ مرید کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ شیخ کے سامنے اس طرح سے ہے کہ جیسے مردہ بہت زندہ، اور یہ اس لئے کہ شیخ امراض نفسانیہ کا عارف اور اس کے علاج کا ماہر ہوگا۔ لہذا اگر اس سے مناقشہ یعنی چون و چرا جائز کر دیا جائے اور یہ کہ مرید اس سے ہر چیز کی دلیل دے لے اور دم (پوچھے تو اس کے لئے ایسے شخص کا معالجہ اگر متعذر نہیں تو متعسر ضرور ہو جائے گا (یعنی ناممکن نہیں تو دشوار یقیناً ہو جائے گا) اس لئے ضرور ہوا کہ بدون منازعت اور مناقشت کے ہر امر میں اس کی بات کو تسلیم کرے اور اس کا متقا در ہے چنانچہ ان حضرات نے یہ تک کہہ دیا ہے کہ معرفت تک وصول اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا

(اور یہ صحیح ہے کیونکہ استاذ اگر کسی بچے سے کہے کہ کہو الف اس پر وہ یہ کہنے لگ جائے کہ کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو وہ پڑھ چکا۔ تحقیق کا مقام حاصل کرنے کے لئے اولاً کسی محقق کی تقلید ضروری ہے

پھر اتنا ذی شیخ کے باب میں شاہ صاحب کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو شیخ بنانے کے لئے اس میں بہت سی شرائط ہیں یعنی ہر شخص کو شیخ نہیں بنایا جاسکتا اس لئے کہ ہر آدمی میں شیخ ہونے کی اہلیت ہونا تو الگ رہا ہر شخص صحیح الفکر اور صحیح الحواس بھی نہیں ہوتا۔ لہذا اگر انتخاب شیخ میں غور و تامل سے کام نہ لیا اور کسی نااہل کو شیخ بنالیا گیا مثلاً اس کی فکر اور حواس ہی درست نہ ہوئے تو اس کا پڑا ہی ہو جائے گا۔ اسی لئے جہاں شیخ نے ضرورت شیخ پر کلام کیا ہے وہیں اس کی علامات بھی بیان کی ہیں۔ چنانچہ علامہ شاطبی نے الموافقات میں عالم متحقق بالعلم کی تین علامتیں بیان کی ہیں اور یہ اسی لئے تاکہ لوگ علم کو اس کے اہل ہی سے لیں اور نا اہل کو مقتدا و پیشوا بنا کر ضیاعِ علم کا سبب نہ بنیں۔

فرماتے ہیں کہ ان تین علامتوں میں سے پہلی علامت یہ ہے

(الاولیٰ) العمل بما علم	ایک علامت تو یہ ہے کہ اپنے علم پر خود
حتى یکون قوله مطابقاً	عامل ہو تاکہ اس کا قول اس کے فعل
لفعله فان كان مخالفاً	کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ اگر اس کا فعل
له فلیس باهل لان	قول کے مطابق نہ ہوگا تو یہ شخص اس کا
یؤخذ عنه ولا ات	اہل نہیں ہے کہ اس سے علم اخذ کیا

یقتدی بہ فی علم

جائے اور نہ اس لائق ہے کہ اسے کسی
علم میں مقتدا بنایا جائے

(الاثبات) ان یكون ممن
رباه الشيوخ في ذلك العلم
لاخذة عنهم وملازمته
لهم فهو الجدير بان
يتصف بما اتصفوا به
من ذلك وهكذا كان
شان السلف الصالح
فاول ذلك ملازمة
الصحابة رضي الله تعالى
عنهم لرسول الله صلى الله
تعالى عليه وآله وسلم
واخذهم باقواله و
افعاله واعتمادهم
على ما يروونه كائناً
ما كان وعلى اى وجه
صدر فهم فهموا مغزى
ما اراد به اولاً حتى علموا
وتيقنوا انه الحق الذى
لا يعارض وحكمة الذى

اور دوسری علامت یہ ہے کہ یہ شخص
ایسا ہو کہ اس علم میں مشایخ نے اس
کی تربیت فرمائی ہو یا اس وجہ کہ اس
ان حضرات سے علم حاصل کیا ہو اور
ان کی خدمت میں برابر رہا ہو تو ظاہر
ہے کہ ایسا شخص اس قابل ہوگا کہ
کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو
جن سے اس کے مشایخ متصف
تھے، چنانچہ سلف صالحین کا یہی
طریقہ تھا یعنی اپنے مشایخ سے اقتد
علم اور ان کی ملازمت کی بناء پر ان
کے اخلاق و صفات سے متصف
ہو گئے تھے، دیکھئے سب سے پہلے حضرت
صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضری کو لازم پکڑا اور آپ کے
اقوال و افعال کو لیا۔ اور جو کچھ آپ
سے صادر ہوا اس پر سبھی نے اعتماد
کیا خواہ وہ جس قسم کی بھی چیز رہی ہو

لا ینکسر قانونہا ولا یحرم
النقص حول حمی کمالہا
وانما ذلک بکثرة الملازمة
وشدة المصارعة -

اور جس نہج پر بھی آپ سے صادر ہوئی ہو اور
خواہ ان حضرات نے آپ کے مقصود کو سمجھا
ہو یا نہ سمجھا ہو یہاں تک کہ انہوں نے سمجھ
لیا اور یقین کر لیا کہ آپ نے جو کچھ کیا یا فرمایا
وہ ایسا حق ہے جس کا معارضہ نہیں کیا
جاسکتا اور ایسی حکمت ہے کہ جس کا قانون
ٹوٹ نہیں سکتا اور جس کمال کے گرد
نقصان چھٹک نہیں سکتا اور اس میں
شک نہیں کہ یہ کیفیت طویل صحبت اور
انتہائی صبر و برداشت کے بعد ہی انسان
میں پیدا ہو سکتی ہے -

اور تیسری علامت یہ ہے کہ وہ شخص جس
علوم کو لیتا ہو اس کی اقتداء بھی کرتا ہو اور
اس کے آداب سے متدرب ہو جیسا کہ تم نے صحابہ
رضی اللہ عنہم کی اقتداء کو نبی کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دیکھا اور ایسے
ہی تابعین کے اقتداء کو حضرات صحابہ
کے ساتھ دیکھا جس سلسلہ - چنانچہ اس
صفت (یعنی اقتداء سلف) کے ساتھ
امام مالکؒ اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہوئے
ہیں یعنی ان کے اندر شدتِ اہتمام اس کا

الثالثة) الاقتداء بمن اخذ
عنه وتادب بآدبه كما
علمت من اقتداء الصحابة
بالنبي صلى الله عليه وسلم
واقتهاء التابعين بالصحابة
وهكذا في كل قرن وبهذا
الوصف امتاز مالک عن
اضرايه اعني بشدة الاتصاف
به والا فالجميع ممن يهتدي
به في الدين كن لك كانوا

ولكن ما لكا اشتغال بالمبالغة
 فن هذا المعنى فلما ترك
 هذا الوصف رفعت البدع
 رؤسها لان ترك الاقتداء
 دليل على امر حدث عند
 التارك اصله اتباع
 الهوى۔

تھا اور نہ تو دین کے جو لوگ بھی پیشوا ہوئے
 ہیں سب ہی ایسے ہوتے ہیں۔ اور لیکن
 امام مالکؒ کی اس باب میں جو شہرت
 ہوئی تو مبالغہ فی الاہتمام کی وجہ سے لیکن
 جب یہ طریقہ متروک ہو گیا تو بدعات نے
 سراٹھایا اس لئے کہ ترک اقتداء اس امر
 کی دلیل ہے کہ تارک کے نزدیک کوئی
 نئی چیز عادت ہو گئی ہے (جب ہی تو
 اس نے طرز قدیم کو چھوڑا) اور اس کی
 اصل اور اس کا منشاء اتباع ہوئی ہے

الموافقات ص ۹۵ ج ۱

دیکھا آپ نے کہ کسی عالم سے علم حاصل کرنے کے لئے علمائے کتنی شرائط بیان
 کی ہیں بس یہی شرائط کسی کو شیخ بنانے کی بھی ہیں یعنی اس کے لئے ضروری ہے
 کہ اولاً وہ شریعت پر خود عامل ہو، ثانیاً اس کی تربیت کسی شیخ کامل نے کی ہو
 جس کے لئے ان کی خدمت میں ایک معتد بہ مدت تک یہ رہا ہو، ثالثاً اپنے
 مشائخ کی کامل اتباع اور ان کی اقتداء کا کامل داعیہ اس میں موجود ہو۔ اس کے
 متعلق صاحب موافقات نے فرمایا ہے کہ جب سے یہ وصف (اتباع اسلاف)
 متروک ہو گیا بدعات نے سراٹھایا کیونکہ جب مشائخ اور اکابر کی ہی اتباع کو آدمی
 ضروری نہ جانے لگا تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنے نفس اور شیطان کی
 اتباع کرے اور اس کا بدعت اور محدث ہونا ظاہر ہے۔

عجیب بات ہے کہ جس علم اور اصول پر چل کر انسان بدعت سے بچ سکتا
 تھا خود اسی مسلک کو بدعت کہا جانے لگا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فی زمانہ دیکھا

جاتا ہے کہ ایک شخص جاہل اللہ بدعمل ہے اس کو تو رہبر اور پیشوا بنایا جا رہا ہے اور جو شخص کو ولی کامل ہے اور اس کے سینہ میں اللہ تعالیٰ نے نور کا اور اپنی معرفت کا خزانہ رکھا ہے اسی کے لوگ مخالف ہو جاتے ہیں بلکہ بعض بعض تو اس کو مسلمان تک نہیں سمجھتے۔ فیہا للعجب

اللہ تعالیٰ کی محبت کی فرضیت

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ علم تصوف عبد نہیں اس لئے کہ اس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور ہویٰ کو پہچانے اور اس کو ترک کر کے اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت اپنے قلب میں پیدا کرے کہ اتباع شریعت کے لئے ہی محرک بنتی ہے۔ اور اتباع شرع فرض ہے اس لئے یہ بھی فرض ہے پس جو چیز فرض پر لگا دے وہ مذموم کیسے ہو سکتی ہے۔ اور باقی رہا یہ کہ اللہ و رسول کی محبت کی فرضیت کہاں معلوم ہوئی تو اس کے متعلق سنئے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

قل ان کان اباکم و ابناءکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموالکم و اقترافتموها و تجارتکم و تخشون کسادھا و مسکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسوله و جہاد فی سبیلہ فترضوا حتی یاتی اللہ بامرہ و اللہ لایہدی القوم الفاسقین	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تم کسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہیں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو
---	--

تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا
حکم بھیجے اور اللہ تعالیٰ بے حکمی
کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود
تک نہیں پہنچاتا۔

اس آیت سے نیز یجبہم ویجبونہ سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی محبت کا ثبوت ہے اور چونکہ یہ نص قطعی ہے اس لئے یہ محبت فرض
ہوگی اور اس کی فرضیت اس لئے ہوئی ہے کہ احکام شرعیہ کا اتباع بدون ان
دو فوں محبتوں کے نہیں ہو سکتا۔ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجہ کی اتباع ہوگی
یعنی اگر محبت کامل ہو تو اتباع بھی کامل ہوگی۔ اور اگر محبت ناقص ہوگی تو اتباع
بھی ناقص ہی رہے گی۔

بہر حال ہر شخص کے لئے اللہ و رسول کی اس قدر محبت فرض ہے جس سے
اوامر کا امتثال اور معاصی سے اجتناب کرے۔ چنانچہ فتح الباری شرح بخاری ص ۱۴
ج ۱ میں اس متحد ثلاث من کن فیہ وجد حلاۃ الایمان ان یکون
اللہ ورسولہ احب الیہ مناسواھما۔ الحدیث کے تحت لکھا ہے کہ
محبة اللہ علی قسمین فرض وندب۔ فالفرض المحبة التي
تبعث علی امتثال اوامره والانتفاء عن معاصیه والرضاء لہما
یقدرہ فمن وقع فی معصیۃ من فعل محرم او ترک واجب
فلتقصیرہ فی محبة اللہ حیث قدم ہوی نفسه والندب
ان یواظب علی النوافل ویجتنب الوقوع فی الشبهات
والمتصف عموما بذلک نادر قال وكذلك محبة الرسول
صلی قسمین۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرض، دوسرے مندوب۔ فرض وہ محبت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ادا کر کے امتثال اور معاصی سے اجتناب اور مقدر پر راضی رہنے پر ابھارے ہیں جو شخص کسی معصیت میں (خواہ کسی حرام شے کے ارتکاب کرنے یا کسی واجب کے ترک میں) واقع ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں قصور کی وجہ سے ہے اس لئے کہ اس نے اپنے نفس کی خواہش کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مقدم کیا۔ اور مندوب محبت یہ ہے کہ نوافل پر مواظبت کرے اور شبہات میں واقع ہونے سے اجتناب کرے اور اس محبت سے متصف بالعموم بہت کم لوگ ہیں اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دو قسم ہے یعنی فرض اور مندوب۔

پس جب اللہ و رسولؐ کی محبت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے تو اس کی تحصیل بھی شرعاً مطلوب و مامور بہا ہوئی اور ابھی ہم نے بیان کیا ہے کہ تصوف کی یہی غرض ہے لہذا اب اس میں کسی کے لئے کیا مجال انکار باقی رہا۔ یہ گفتگو تو ان امور کے متعلق ہے جو طریق میں مقصود کا درجہ رکھتے ہیں باقی اس میں شک نہیں کہ بہت سی چیزیں اشخاص اور ازمہ کے مناسب بطور وسائل اور ذرائع کے بھی اختیار کی جاتی ہیں جو مکہ یہ سب بھی مکملات دین سے ہیں اس لئے ان کو مقصود سمجھنا تو یقیناً غلطی کی بات ہے لیکن اپنی حد پر رکھ کر ان پر عمل کر لینا یہ بدعت مذمومہ نہیں ہے اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ کسی طبیب نے نسخہ میں مثلاً شربت بنفشہ لکھا۔ مریض کو شربت بنفشہ کی ضرورت ہے مگر بازار میں نہیں ملتا اس لئے وہ اس مقصود کی تحصیل کی خاطر کچھ وسائل اختیار کرتا ہے کہ لکڑیاں لاتا ہے آگ جلاتا ہے شکر لاتا ہے دیگی لاتا ہے، پانی و بنفشہ لاتا ہے اور شکر و بنفشہ وغیرہ کو دیگی میں ڈال کر

آگ پر پکاتا ہے اور شربت بنفش تیار کر کے نسخہ کی تکمیل کرتا ہے تو یہ طریقہ لانا، آگ جلانا وغیرہ وغیرہ زیادہ فی النسخہ نہیں ہے بلکہ تکمیل النسخہ ہیں اسی طرح سو فیائے کرام نے بھی جو وسائل اذکار و اشتغال وغیرہ اختیار فرمائے ہیں یہ سب محبت کی تکمیل اور نسبت احسان کی تحصیل کے لئے ہیں گویا یہ متمات و مکملات دین سے ہیں محبت کی تکمیل و تحصیل کے لئے ان کو اختیار کیا جاتا ہے۔

از پیئے وصل نگارے حیلہا انگینہ ختم
ان کو اصل دین اور مقصود کوئی نہیں سمجھتا۔

اقسام نفس | اب یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے جو چیز نافع و حاجب

بنتی ہے وہ انسان کا نفس ہے، علمائے حقیقت نے مختلف تطورات کے اعتبار سے اس کے سات درجے قائم فرمائے ہیں اور ہر درجہ کے لحاظ سے اس کے الگ الگ نام بتائے ہیں۔ امارہ۔ لوامہ۔ ملہمہ۔ مطمئنہ۔ راضیہ۔ مرضیہ، کاملہ، قرآن شریف میں امارہ اور راضیہ، مرضیہ، اور مطمئنہ کا ذکر آیا ہے قال اللہ تعالیٰ - وَمَا أُبْرِيْ لِنَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَا مَسَادَةَ بِالسُّوءِ وَاَقْسَمُ بِیَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللّٰوَاْمَةِ وَاَقْسَمُ بِالنَّفْسِ الْمُطْمَئِنَّةِ اَنْحِیْ اِلٰی سَرِّكَ مَا ضَمِنَتْ

نفس امارہ | ہم یہاں پر ان میں سے صرف امارہ، لوامہ اور مطمئنہ کا کچھ بیان کرتے ہیں۔ صاحب ترصیع فرماتے ہیں کہ نفس امارہ کو امارہ اس لئے کہا

جانتا ہے کہ وہ برائیوں کا حکم دیتا ہے اور نفس کی یہ قسم نہایت ہی خبیث ہے ایک معمولی شہوت کے بدلے اپنی آخرت ہی کو بیچ دیتا ہے۔ چنانچہ بخل، حرص، حسد، جھگڑ، کبر، شہوت، غضب، غفلت، شدت طمع، سوئے خلق، بیکار باتوں میں مشغولی، مخلوق کے ساتھ استہزاء، بغض، ہاتھ اور زبان کے ساتھ ایذا رسانی وغیرہ یہ سب اسی کی صفات ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ نفس اس درجہ میں اپنی طبیعت کے ظلمات میں پڑا رہتا ہے، پس وہ خیر و شر میں تمیز ہی نہیں کرتا بلکہ شیطان کا اس کے اغوار میں وسیلہ اور آلہ کار بنتا ہے۔ چنانچہ تمہارے دو دشمنوں میں سے یہ بڑا دشمن ہے لہذا اس سے بہت ہی زیادہ بڑا دشمن رہو۔

اور پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں کہ اس مقام میں تم پر لازم ہے کہ ابواب شریعت پر وقوف کرو اور ہر آن اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو اور اس کو موت سے عذاب قبر سے اور قیامت کے ہولناک حالات سے ڈراتے رہو، نیز اپنے لئے ذلت، انکسار، مسکنت، خضوع اور انوارِ برادرِ نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی جانب تضرع اور ابتهال کو لازم کرو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری طبعی ظلمت سے نکال دے۔ اور یہ ہرگز نہ کرنا کہ گھبرا کر اور بول ہو کہ دعا کرو ناچھوڑ دو۔ یا فتح اور کامیابی کو بعید سمجھ کر اس کی جانب سے سست اور تنگ دل ہو جاؤ۔ اس لئے کہ یہ چیزیں تو مرید کے رشتے ہی کو منقطع کر دینے والی ہیں لہذا جو چیزیں بتلائی ہیں ان میں تندہی کے ساتھ لگو اور جو امور کہ تم کو تمہارے مولا سے مشغول کر دینے والی ہوں ان سے اعراض کرو، قناعت کو لازم رکھو اور لذت کو اور بے فائدہ امور میں مشغولی ترک کرو، اپنے رب سے گریہ و زاری کرو اور ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہو جاؤ اس مرتبہ میں یہی سب کام تمہارے کرنے کے ہیں

نفسِ لوامہ | یہاں تک تو نفسِ امارہ کا بیان تھا۔ اب نفسِ لوامہ کے متعلق سنتے۔

نفسِ لوامہ کو لوامہ اس لئے کہتے ہیں کہ جب اس کا صاحب کسی برائی میں واقع ہوتا ہے تو یہ اس کو ملامت کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی صفات میں سے ملامت ہوئی۔ مکر۔ عجب۔ ریا۔ ظلم۔ غیبت۔ کذب۔ غفلت۔ حسد ریاست۔ حسبِ شہوت۔ وغیرہ امور ہیں۔ اور کبھی اس نفس کے ساتھ ساتھ نفسِ امارہ کی بھی بعض صفات پائی جاتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتا ہے۔ اور اب یہ نسبت پہلے کے زیادہ سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کو ملکوتی مصباح سے جسے اللہ تعالیٰ قلبِ سالک میں روشن فرماتے ہیں کچھ روشنی مل جاتی ہے۔ ایسی کہ پھر وہی باعث بنتی ہے اس بات پر کہ سالک مجاہدہ کے ذریعہ صفات مذمومہ سے خلاصی پاتے اور اخلاقِ حمیدہ کے ساتھ متصف ہو جاتے لیکن ابھی تک وہ خلاصی پائے نہیں ہوتا۔ مگر ضرعت کی موافقت کی اس میں ایک رغبت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور اس کے لئے مجاہدہ کا خیال بھی ہو جاتا ہے چنانچہ اس مرتبہ میں اس کے لئے کچھ صالح اعمال بھی ہوتے ہیں، مثلاً قیام، صیام، صدقہ وغیرہ۔ لیکن ان میں ردائل کی بھی آمیزش رہتی ہے۔ مثلاً عجب و ریا، اور اپنے اعمالِ صالحہ پر مخلوق کی حمد و ثنا کی خواہش وغیرہ کا ہونا لہذا ان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں پر اپنی ان برائیوں کو (مثلاً عجب و ریا) ظاہر کر دو، ورنہ یہی سبب انقطاع بن جائے گا۔ پس اس سے خلاصی کے لئے ایک تو مجاہدہ کرنا ہو گا اور دوسرے کثرتِ ذکر۔ اب اگر اس پر وحدتِ افعال ظاہر ہو چکا ہے تو پھر اس سے عجب و ریا کا تو خاتمہ ہی ہو جائے گا اس لئے کہ وہ اس وقت کسی عمل کو

اپنا سمجھے گا ہی نہیں تو عجب کس پر کرے گا۔ وہ تو ہمہ وقت اپنے خالق اور مولا کی حمد اور شکر ہی میں لگا رہے گا اور اس بات سے ڈرتا رہے گا کہ اگر شکر میں کوتاہی ہوئی تو یہ دولت بھی سلب ہو جائے گی۔ پس عجب وریاء تو نہ ہوگا البتہ اس مقام میں خواطر و وساوس۔ افکار کی کثرت ہو جاتی ہے۔ لہذا ذکرِ جہر کے ذریعہ انہیں دور کرے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا رہے جن و انس میں سے ہر اس قاطع سے جو اللہ تعالیٰ سے اس کو قطع کر دے۔ یہ بیان نفسِ لوائمہ کا تھا۔ اب نفسِ مطمئنہ کے بارے میں سنتے ہیں۔

نفسِ مطمئنہ | نفسِ مطمئنہ کی صفات میں سے جو دو تو کل ہے، عبادت اور تذلل ہے، رضا اور شکر ہے، خشیت اور اتباع

سنت ہے، اس طور پر کہ امور تکلیفیہ سے ایک بالشت بھی ادھر ادھر نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی صحیح عبودیت اختیار کر کے غیر اللہ سے غنائے تام حاصل کرنا ہے۔ اور سالک کے اس مقام میں داخل ہونے کی علامت یہ ہے کہ تکلیفاتِ شرعیہ میں اس کی کوشش زیادہ ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کے ساتھ وہ متعلق ہو جائے اس طرح سے کہ آپ کے اقوال صحیحہ کی اتباع کہئے بغیر اس کو چین نہ آئے اس لئے کہ یہ مقام تمکین عین الیقین اور ایمان کامل کا مقام ہے اور اس مقام میں ناظرین کی آنکھیں سالک کی زیارت سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور اس کے اقوال کی جانب سامعین کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ اگر وہ ساری عمر کلام کرتا رہے تو سچی اس سے ملول نہ ہو جائے اور یہ اس لئے کہ اس کی زبان اس مقام میں ان حقائقِ اشیاء اور اسرارِ شریعت کی ترجمان ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں دلاتے ہیں چنانچہ کوئی کلمہ وہ تکلم نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ اللہ و رسول کے

فرمان کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اور اس کا یہ سب بیان کرنا کسی کتاب کے مطالعہ یا کسی سے سنتے کامریوں منت نہیں ہوتا اور اس کے باطن میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آتی ہے انا سرتک ایہا الحلیب وانت سری فقر عینا و طب نفسا (یعنی اے حبیب میں تیرا سر ہوں اور تو میرا سر ہے پس اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر اور اپنے نفس کو خوش کر) اس وقت اس سالک کے قلب سے اضطراب دور ہو کر اس کو ایک قسم کا اطمینان نصیب ہو جاتا ہے (چنانچہ اسی جہت سے اس کو مطمئن کہا جاتا ہے) اور اب وہ اس دقت حیاء اور ادب کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے خشیت اور ہیبت کو لازم کر لیتا ہے مخلوق کی قبولیت اور ان میں جو عز و وقار اس کو حاصل ہوتا ہے اس کی گڈڑی کو اتار پھینکتا ہے اور عالم کون کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد کل من علیہا فان کی حقیقی تفسیر سمجھ میں آ جاتی ہے۔

پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

کہ جب تم اس مقام میں پہنچو گے تو تمہارا میلان اور ادو ادعیمہ کی جانب بھی ہو گا۔ اور تمہارے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کچھ اور ہی انداز کی ہو جائے گی جو اس سے پہلے والے مقام کی محبت سے مختلف ہو گی۔ اور یہ یاد رکھو کہ خبردار اس مقام پر پہنچ کر دعویٰ کمال کبھی نہ کرنا یعنی یہ نہ سمجھنا کہ میں ہو گیا ہوں اور نفس سے چھوٹ گیا ہوں کیونکہ اس وقت تو تم نفس کے شر سے مامون ہو جاؤ گے اور اس کے کید سے مطمئن و غافل حالاکہ دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا چاہئے اگرچہ وہ دوست ہی کیوں نہ ہو جائے۔

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت دام دان و گرچہ دانہ گویدت۔
اور اس مقام میں کبھی حبت ریاست، شہرت اور اپنے آپ کو مشیخت اور

ارشاد کے مقام میں ظاہر کرنے کا داعیہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو ان میں سے کسی چیز کو اپنے نفس کے لئے مت تجویز کر لینا۔ بلکہ اس سے بہت دور رہنا۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ ہی تم کو مشیخت کا لباس پہنائیں اور حلیہ قبول سے آراستہ فرمائیں جس میں تمہارا کوئی دخل نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے نفس کے لئے نہیں اور جو کچھ کرو اللہ کی مراد سمجھ کر۔ اور اللہ کے اختیار سے کرو نہ کہ اپنی مراد اور اپنا اختیار سمجھتے ہوئے۔

اور علامت اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے مقام ارشاد پر تم کو فائز کر دیا ہے یہ ہے کہ تم اپنے سب بھائیوں کی نظروں میں محبوب ہو جاؤ اور وہ سب کے سب تمہارے امر و نہی کے مطیع ہو جاویں۔ بایں ہمہ تم اپنے لئے ان پر کوئی تمیز اور فوقیت، فخر و سلطنت نہ دیکھنا۔ بلکہ یہی سمجھنا کہ وہی سب لوگ تم سے افضل ہیں۔

پھر آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ جب یہ مقام تم کو حاصل ہو جائے یعنی تم اپنے نفس میں رحمانی طمانیت پانے لگو اور تمہارا قدم کتاب و سنت کے بال برابر بھی نہ پھسلے بلکہ اتباع شریعت تمہارے گوشت پوست میں سرایت کر جائے گو یا شریعت ہی تمہاری طبیعت بن جائے تو تم کو اللطاف الہی کا ہاتھ پورے طور پر جذب کر لے گا (اور یہی یحبیکم اللہ ہے) اور یہ جذب اس جذب کے مغائر ہو گا جو اول سلوک میں پیش آیا کرتا ہے (اور وجہ مغائرت یہ ہے کہ یہ جذب اتباع کے بعد ہوا ہے یعنی اس کا سبب اتباع بنتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحبیکم اللہ اور پہلا اتباع سے پہلے کا ہے) اور تمہارے نفس میں سر السکر کی لسان سے یہ نرا دی جائے کہ یا یتھا النفس المطمئنة الرجعی الی ربک را حنیۃ مرضیۃ اور پھر تم پر ایک خاص قسم کا نسیان

طاری ہو جائے گا جس کی وجہ سے تم دنیا اور آخرت کی کسی چیز کا ادراک ہی نہ کر سکو گے بجز اس کے کہ وہ تمہارے سامنے ہو اور جہاں وہ تم سے غائب ہوئی بس تم بھی اس سے غائب ہو جاؤ گے اور یہ اس لئے کہ تمہارا قلب اس وقت جمال حق کے مشاہدہ میں علی الدوام مشغول ہو جائے گا۔ نہ اس سے تنہلے گا اور نہ اس سے اس کو سیری ہی ہوگی، یہ بیان نفس مطمئنہ سے متعلق تھا جس کو صاحب ترصیع نے بیان کیا ہے۔

میں نے یہاں نفس کا بیان ذرا تفصیل سے اس لئے کیا ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس کو مغلوب کرنا کس قدر زبردست مجاہدہ ہے اس کی اہمیت کو حضرات صوفیہ نے سمجھا اور لوگوں کو یہ سمجھا دیا کہ اس کو اگر زیر کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف محبت سے یعنی جب اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو جائے گی تو نفس ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ علم تصوف میں اصل یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ صحیح نسبت اور حقیقی رابطہ پیدا کیا جائے اسی کی تحصیل کے لئے حضرات صوفیہ نے اپنے ذمہ تین چیزیں لازم کر لی ہیں۔ اخلاء خواطر، معالجات اخلاق اور نفی غفلت، چنانچہ رسالہ کشمیریہ میں ہے کہ:-

اعمال صوفیہ

لیس للمریدين كثرة الادوار	مریدین کا وظیفہ اور ادوار ہری کی کثرت
بالظاهر فان القوم في مكابد	نہیں ہے اس لئے کہ قوم کا مجاہدہ تو
اخلاء خواطرهم ومعالجة	بس تین چیزوں کا ہے۔ اخلاء خواطر
اخلاقهم ونفى الغفلة عن	روئے عن القلب یعنی قلب سے ردی وساوس
قلوبهم لا في تلكين اعمال	کا ازالہ، معالجات اخلاق اور نفی غفلت

البدر۔ الذی لا ید لہرمہ
اقامۃ الفرائض والسنن
الراتبۃ فاما الزیادات من
الصلوات النافلۃ فاستدل
الذکر بالقلب اتم لہم
(رسالہ کشمیریہ ص ۲۰)

باقی اور عبادات وغیرہ کی کثرت
وغیرہ مطلوب نہیں پس جو ان کے
لئے ضروری ہے وہ یہ کہ فرائض ادا
کریں اور سنن رواتب (مؤکدہ) کا
اہتمام کریں اور رہیں دیگر نقلی نمازی
تو قلب کو ذکر کے ساتھ مداوم رکھنا
یعنی ذکر قلبی کا اہتمام کرنا ان کے لئے
کہیں زیادہ بہتر ہے۔

اب دیکھتے جن اشیاء کو یہ حضرات قوم کا وظیفہ فرماتے ہیں ان میں سے
کوئی چیز بدعت ہے، خواہ وہ سادوں کا معاملہ تو معلوم ہی ہے کہ کس قدر اہم ہے
بعض مرتبہ ایک معمولی سا دوسوہ منجہالی الکفر ہو جاتا ہے اسی طرح سے اخلاق
کی درستگی کا مستم بالشان ہونا بھی ظاہر ہی ہے۔ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحب
فرماتے ہیں کہ بدون اصلاح اخلاق کے سالک کے اندر وصول الی اللہ کی
استعداد تک نہیں پیدا ہوتی۔ حضرت کا یہ ارشاد حدیث شریف سے مؤید ہے
کیونکہ حدیث میں ہے کہ

ان العبد لیبلغ بحسن خلقه
عظم درجات الاخرة وشرف
المنازل وانه لضعیف العبادۃ
وانہ لیبلغ بسوء خلقه اسفل
درک جہنم وانه لعابد

بلاشبہ بندہ اپنے حسن خلق کے ذریعہ آخرت
کے بڑے درجات اور منازل پالیتا ہے
حالانکہ وہ عبادت میں ضعیف ہوتا ہے
اسی طرح سے اپنے سوء خلق سے جہنم کے
نچلے طبقہ کا مستحق ہو جاتا ہے حالانکہ وہ
کثیر العبادت ہوتا ہے۔

اس سے کس قدر اخلاق کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ اس کا درجہ عبادت سے بھی بڑھا ہوا ہے اسی طرح سے نفی غفلت کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہے کہ یہ غفلت ذکر کے منافی ہے اور اسی کی وجہ سے حق تعالیٰ سے نسبت اور تعلق سے محرومی رہتی ہے۔

غرض تصوف میں مقصود تو یہی نسبت اور تعلق ہے
علاج غفلت باقی اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مشائخ نے اپنے اپنے طور پر بعض طریقے تجویز کئے ہیں جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کا ماخذ شرع میں موجود ہے، چنانچہ اشغال و مراقبات مثل تصویر شیخ وغیرہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں یعنی ذریعہ ہیں مقصود نہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:-

ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقہ کے وضع کئے سو یہ سب مقدمات اسی کے ہیں کوئی طریق معین نہیں ہر شخص کا طریق جداگانہ ہے مگر اس زمانہ میں ترک تعلق کو شرط کامل ٹھہرایا ہے۔

نخست موعظ پر محصل اس سخن است کہ از مصاحب نا جنس اقتراز کنید
 (مکتوبات رشیدیہ ص ۷۹)

امد شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-
 تعلق حجاب است و بے حاصلی چو پیوند با بگسلی واصلی
 ارواح تلشہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ملاحظہ نقل کیا گیا ہے کہ جس سے اس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ:-

”آدمی کے لئے سینکڑوں بات ہیں جو اس کو توجہ الی الحق سے مانع ہیں کہیں

اس کا دل مال میں الجھا ہوا ہے کہیں جاہ میں کہیں چور میں کہیں اولاد میں کہیں معشوق میں الی غیر ذلک، غرض کہ اس کا دل ہزاروں مطلوبات میں مشغول ہے اور یہ مشغولی اس کو توجہ الی الٰہی سے مانع ہے جب مشائخ نے جو اطباء روحانی ہیں اس مانع کو محسوس کیا تو اس کا علاج تصور شیخ تجویز کیا تاکہ اس کا قلب سب طرف سے ہٹ کر ایک مرکز پر آٹھہرے اور اس میں مقصود اصلی کی طرف توجہ کی استعداد پیدا ہو جائے گو یہ تصور خود بھی بت یعنی غیر مقصود تھا مگر بضرورت جمع خاطر اس کو اختیار کیا گیا تھا جب ان کے افکار و خیالات ایک مرکز پر جمع ہو کر اس قابل ہو جاتے تھے کہ وہ مقصود اصلی و حقیقی یعنی حضرت حق کی طرف متوجہ ہو سکیں تو اس بت کو بھی توڑ دیتے تھے اور تصور شیخ کو بیچ سے ہٹا کر اس قلب کو براہ راست حق تعالیٰ سے وابستہ کر دیا جاتا تھا یہ اصلی غرض تھی تصور شیخ کی اور یہ مقصد تھا اس کا (ارواحِ ثلاثہ) چنانچہ جو حقیقی مشائخ تھے انہوں نے ہر چیز کو اپنی حد پر رکھا اور جو لوگ اس میں مدعی اور دخیل ہو گئے انہوں نے حدود کا لحاظ نہیں کیا بلکہ مقصود کو غیر مقصود غیر مقصود کو مقصود بنا لیا کیونکہ ان کا مطلوب دین تو تھا نہیں اس لئے مشائخ کا بھیس یہن کہ اور ان کے الفاظ چرا کہ اپنا مطلب حاصل کیا اور اپنے مرتبہ سے بڑھ کر دعاوی کئے جس کی وجہ سے پھر وصول ہی سے محروم رہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ

حرف درویشیاں بدزد مرد دواں تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

اور صاحب رسالہ قشیریہ نے اس کو مریدین کے قلوب کے لئے مضر ترین

نصیہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

مرید کے لئے سب سے زیادہ مضر شے طلب جاہ ہے

ولا شئ اضر لقلوب المریدین
من حصول الجاہ قبل
خسور بشریتہم ومن اداہ
المرید ان لا یسبق علمہ
فی ہذا الطریقتہ منازلتہ
فانہ اذا تعلم سیر ہذا
الطائفتہ وتکلف الوقوف
علی معرفۃ مسائلہم
واحوالہم قبل تحقیقہ
بہا یا لمنازلۃ والمعاملۃ
بعد وصولہ الی ہذا
المعانی

یعنی بشریت کے مغلوب ہونے سے
قبل مریدین کے قلوب میں جاہ پیدا ہو جائے
سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ
مرید کے آداب میں سے ہے کہ اس طریق
میں اس کا علم اس کے مرتبہ سے آگے
نہ بڑھنا چاہئے کیونکہ اگر اس کو صوفیہ
کے سیر کا علم ہو گیا اور اس نے ان کے
مسائل اور ان کے احوال کی معرفت
ان کے ساتھ متصف ہونے اور
ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے حاصل
کر لیا تو پھر تو اس کا وصول ان احوال
تک کبھی بھی نہ ہو گا۔

ولہذا قال المشائخ اذا
حدث العارف فجهلوه
فان الاخبار عن المنازل
دون المعارف ومن غلب
علمہ منازلتہ فهو صاحب
علم لا صاحب سلوك
(قشیریہ)

اور اسی لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ
جب کوئی عارف معارف کی خبر دے تو
اس کو جاہل سمجھو اس لئے کہ خبر منازل
(یعنی طے شدہ راہ) کی دی جاتی ہے۔
معارف کی نہیں اور جس شخص کو منازل
کا پہلے ہی سے علم ہو گیا ہو وہ علم والا
تو کہلائے گا مگر اس کو صاحب سلوك
نہیں کہا جائے گا۔

میرا مقصد اصلی تصوف حقیقی صوفیہ کی نصرت نہ غیروں کی

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی صوفی اور ہوتے ہیں اور ڈینگ ہانکنے والے اور چنانچہ میں یہاں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس سے میرا مقصد اصلی اور حقیقی تصوف کو سراہنا اور اسی کی نصرت کرنا ہے تاکہ لوگ اہل طریق سے جو کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور محبوب بندے ہیں بدظن اور متنفر نہ ہوں اور ان کی شان میں بدزبانی کا معاملہ روا نہ رکھیں کہ یہ ان کے حق میں سراسر موجب حرمان و تحران ہے باقی جو لوگ کہ صرف بدعیانِ طریق ہیں حقیقی صوفی نہیں ہیں بلکہ صرف صوفیوں کا بھیس بنا کر اصلی تصوف میں تغیر و تبدل کر کے اس کو خلاف شرع بنالیا ہے تو ان متصوف کی حمایت مجھے منظور نہیں اور نہ اس تصوف کے ہم تنوید ہیں۔ کیونکہ جس جماعت نے کتاب و سنت کے بتلاتے ہوئے راستہ کے خلاف راہ اختیار کر رکھی ہو تو اس پر تو خدا کو اعتراض ہے خدا کے رسول کو اعتراض ہے دین و شریعت کو اعتراض ہے اس مسلمانوں کو بھی اس پر اعتراض ہونا ہی چاہئے اور ایسے لوگوں کو آخرت میں جو سزا ملے گی وہ ملیگی ہی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے یہ بھی ایک دنیوی عذاب ہے کہ مخلوق خدا کے دل میں ان کی جانب سے نفرت اور ان کے بارے میں زبانوں پر ملامت جاری ہے۔

حضرت رفاعی فرماتے ہیں کہ :-

میرے نزدیک جو صوفی فقیہہ (یعنی عالم) کی حالت پر انکار کرے (یعنی اس کو بُرا کہے) یقیناً مبتلائے قہر ہے اور جو فقیہہ صوفی کی حالت پر انکار کرے (اسکو بُرا کہے) وہ بھی راندہ درگاہ ہے۔ ہاں اگر کوئی عالم صرف اپنی زبان سے حکم کرتا ہو۔

شریعت کی ترجمانی نہ کرتا ہو یا صوفی اپنے طور پر راستہ طے کر رہا ہو شریعت کے موافق نہ جلتا ہو تو پھر ایک دوسرے کو برا کہنے میں کسی پر گناہ نہیں۔

(البنیان المشید ص ۱۵۸)

لہذا اب ایسے لوگوں کی نصرت جائز ہی کب ہے؟ اس لئے میری اس گفتگو کا مصداق نہ تو متصوف زمانہ ہیں اور نہ رسمی تصوف ہے بلکہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ اصلی تصوف اور حقیقی صوفیوں کے متعلق کہا ہے جو کہ متمسک بالشریعت تھے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اپنے نور ایمان سے نہ معلوم کتنے قلوب کو منور کر دیا تھا اور اخلاص، اخلاق، اور شفقت علی الخلق کے ذریعہ لوگوں کے قلوب میں گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ حضرات اس حدیث کے پورے پورے مصداق تھے کہ **«وَاللّٰهُ تَعَالٰی حُبَّ کَیْسٍ بِنَدَے سَے مَحَبَّت فرماتے ہیں تو جبریل سے فرماتے ہیں کہ میں اس بندہ سے مَحَبَّت کرتا ہوں تم بھی اس سے مَحَبَّت کرو پھر اس کے لئے آسمان اور زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے اور وہ سب کو محبوب اور سب کے نزدیک مقبول ہو جاتا ہے»**

تصوف کی بدنامی کی ایک خاص وجہ | میرا یہ خیال ہے کہ جن حضرات کو تصوف اور اہل تصوف پر

انکار ہے وہ غالباً اسی دوسری ہی قسم پر ہوگا باقی جو حضرات کہ شریعت سے جس قدر قریب ہیں ان پر لوگوں کو اعتراض بھی کم ہوگا۔ تو یہ صحیح ہے کہ شریعت ہی تو اصل ہے چنانچہ ہم بھی جو نصرت صوفیہ کی کر رہے ہیں وہ اسی لئے کہ ہم دیانتہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے قلوب میں شریعت کا پورا پورا احترام ہوتا ہے اور اس اور اس پر یہ حضرات پوری طرح عامل ہوتے ہیں لیکن حقیقی صوفیہ میں بھی ایک طبقہ ایسا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں تو صادق تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ سے صحیح

نسبت اور تعلق بھی حاصل ہوا ہے مگر عملاً کچھ تسامحات بھی ان سے ہو گئی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علم شریعت کا باب نہایت وسیع ہے اس کا احاطہ ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔ اس لئے بظاہر جو کوتاہیاں اس جماعت سے ہوئی ہیں اس کا سبب ان کی کج خلقی اور اس کا منشاء قلت علم تھا۔ چنانچہ انہیں کی وجہ سے تصوف بدنام ہوا یعنی اس جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اخلاق کا مظہر اور نمونہ ہونا چاہئے تھا اس سے اس میں کمی ہوئی اسی لئے اس جماعت ہی کو لوگوں نے بدخلق مشہور کر دیا اور سبب اس کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے تو ان کو محبت اور تعلق حاصل ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کے حقوق کی رعایت نہیں کی گئی بلکہ بہت سے لوگوں نے مخلوق سے تعلق کو خالق سے تعلق کے لئے حاجب اور مانع سمجھا اس لئے انہیں مخلوق سے ملنے ہی میں وحشت اور ایک قسم کی جھنجھلاہٹ ہوئی یہ لوگ تو اس پر مطمئن تھے کہ مخلوق ہم کو چھوڑ دے تو اچھا ہی ہے خالق کے ساتھ ہمارا معاملہ یکسور ہوگا لیکن مخلوق نے اسی کو ان کا نقص جانا اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنے اس اعتراض میں حق بجانب ہیں کیونکہ شریعت نے جہاں خالق کے حقوق ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے وہیں مخلوق کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی ہے اللہ و رسول نے اس امر کو پسند نہیں فرمایا ہے کہ انسان ان کے حقوق اس طرح سے ادا کرے کہ مخلوق کا حق ہی فوت ہو جاتے

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبداللہ! مجھے خبر پہنچی ہے کہ تم ہمیشہ تمام دن روزہ رکھتے ہو اور ساری راتیں نماز میں گزارتے ہو۔ کیا یہ صحیح ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! صحیح ہے اپنے فرمایا ایسا مت کرو بلکہ یہ کرو کہ روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز

بھی پڑھو اور سو بھی رہا کرو۔ اس لئے کہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے اہل خانہ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان اور تمہارے پاس آئے جانے والے دوست و احباب کا بھی تم پر حق ہے اس کی شرح میں صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ بدن کا تم پر حق ہے لہذا کھانے پینے اور سونے اور عبادت کرنے میں اس کی حفاظت رکھو۔ پس تمام ایام روزہ رکھنے میں اور ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنے میں قوی کا انحطاط اور بدن کا اختلال ہے پس افراط و تفریط سے بچو، ایسا نہ ہو کہ تکثیر فی العبادت انقطاع عن العبادت کا سبب بن جائے، اور یہ جو فرمایا کہ تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اگر اسی طرح صیام و قیام کرتے رہو گے تو ان کے ساتھ سلوک اور حسن معاشرت نہ برت سکو گے اور ان کی خاطر مدارات اور خدمت نہ کر سکو گے یا تو اس لئے کہ کثرت عبادت سے تمہارا بدن ہی ضعیف ہو جائے گا یا اس لئے کہ تمہارا سوء خلق قوی ہو جائے گا۔

دیکھتے صاحب مرقاۃ نے صوفیوں کا کیسا چور بگڑا۔ سبحان اللہ یہ حضرات ہیں حقیقی معنی میں محافظِ دین اس جماعت کی دکھتی ہوئی رگ ہی بگڑی۔ فرماتے ہیں کہ تکثیر عبادت سے انسان کا سوتے خلق قوی ہو جاتا ہے و جب اسکی وہی بوجھ نہ کو ہوئی کہ ان حضرات کو حق تعالیٰ سے ایک ربط خاص اور اس کی عبادت و اطاعت سے انس پیدا ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کا تعلق اپنے معاملہ میں محل معلوم ہوتا ہے اس لئے یہ حضرات مخلوق سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور کبھی ان سے الحجز جاتے ہیں۔ اب لوگ بجاتے اس کے کہ ان کو اس میں معذرت سمجھیں یہ خیال کہ نے لگتے ہیں کہ یہ بد خلق ہیں ایسا واقع میں چاہے ایسا ہو یا نہ ہو۔ بہر حال اس کا ہر تو قابل اعتراض ہے ہی۔ اس لئے کہ اخلاق نبوی کے خلاف ہے

باقی اس کا منشاء ان لوگوں کا تعلیمات شرعیہ سے جہل اور بلاشبہ یہ لوگ ناقص ہیں
کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا بھی حق پورا ادا کیا جائے اور مخلوق کے حقوق
بھی۔ گویا ایک ہاتھ میں اگر سندانِ عشق ہو تو دوسرے ہاتھ میں شریعت کا جام بھی کھنا
ضروری ہے مگر ان دونوں کے ساتھ کھیلنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔
برکف جامِ شریعت برکف سندانِ عشق

ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سندانِ باختن
غرض اس سے تو انکار نہیں کہ تصوف میں کامل درجہ یہی ہے کہ شریعت کی
بھی پوری پور رعایت کی جائے۔ اب اگر کسی سے اس کے علم کی کمی کی وجہ
سے کچھ کوتاہیاں ہو گئی ہیں تو اس کی وجہ سے طریق ہی کی مذمت اور مطلقاً اس
کا انکار کرنا تو صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشکل تو دوسری جگہ بھی پیش آتی ہے
مثلاً دیکھئے اسلام ایک دین ہے اس کے ماننے والے بہت سے لوگ
ہیں لیکن کیا سب لوگ برابر کے درجے کے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے
اگر بہت سے لوگ کامل موجود ہیں تو ایک جماعت ناقص العمل بھی پائی جاتی
ہے تو کیا اس کے فسق اور بد عملی کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا جاسکتا ہے؟
اس کا سرے سے انکار کر دینا ہی صحیح ہے؟ اسی طرح ایک مدرسہ میں بہت
طلباء پڑھتے ہیں مدرسین ان کو پڑھاتے ہیں لیکن کیا سب ایک ہی استعداد
کے نکلے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بہت سے عالم و فاضل ہوتے ہیں تو بہت سے
ناقص الاستعداد اور جاہل رہ جاتے ہیں تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان کے
نقص و جہل کی وجہ سے کیا ان اساتذہ کی تعلیم پر اعتراض کیا جاسکتا ہے؟
لہذا جب ایک استاذ کے تمام شاگردوں کا برابر ہونا ضروری نہیں اور کسی شیخ
کے تمام مریدین کا یکساں ہونا لازم نہیں اور اس کی وجہ سے ان حضرات کے فضل

و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا اسی طرح تصوف کو بھی سمجھ لیجئے کہ ایک طریق و مسلک ہے جس کا مقصد تو شریعت ہی پر عمل کرانا ہے اور ظاہری و باطنی کمال کے ساتھ انسان کو متصف گردانتا ہے لہذا جو طالب صادق مخلص اور موفق من اللہ ہوتا ہے وہ تو صحیح راستہ پکڑ لیتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے اور جو لوگ اس درجہ کے نہیں ہوتے وہ اپنی راہ کچھ کھوٹی ہی کر لیتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشائخ اپنے کو دھن دیتے ہیں لیکن ان کے پاس آنے جانے والے پورا خلوص نہیں اختیار کرتے تو اس میں مشائخ کا یا تصوف کا کیا قصور ہے۔

طریق صوفیہ و فقہاء کا منتہی ایک ہے | حاصل کلام یہ کہ حقیقی تصوف شرع

کے مزامم نہیں ہے جیسا کہ حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ:۔
 ”بزرگو صوفیہ کے طریق کا منتہی وہی ہے جو فقہاء کے طریق کا منتہی ہے اور فقہاء کے طریق کا منتہی وہی ہے جو صوفیہ کے طریق کا منتہا ہے جن گھائیوں میں بھنس کر فقہاء مقصود کی طلب سے رہ جاتے ہیں انہیں گھائیوں میں صوفیہ بھی اپنے سلوک میں مبتلا ہوتے ہیں دونوں کو مقصود سے روکنے والی ایک ہی چیز ہے یعنی غرض نفسانی اور حب دنیا و حب جاہ اور دونوں کو مقصود تک پہنچانے والی بھی ایک ہی چیز ہے یعنی اخلاص اور ماسوائے حق سے منہ پھر لینا طریقت عین شریعت ہے اور شریعت عین طریقت ہے دونوں میں صرف لفظی فرق ہے اصل اور مقصود اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے“ (البنیان المتشید ص ۱۵۸)
 یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے ہر زمانہ میں علمائے ربانی کا احترام کیا ہے اور یہ سمجھ کر کہ جس طرح ہمارے جماعت کے بہت سے لوگوں سے جو علوم شرعیہ پر حاوی نہیں تھے کچھ تفرشیں ہو گئی ہیں اسی طرح جماعت علماء بھی جو کچھ

ہمارے حالات اور مقامات سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکی اس لئے انہوں نے بعض باتوں کو خلاف شرع سمجھتے ہوئے ہماری تکفیر تک کر دی تو ہم بھی ان کو اس میں معذور سمجھتے ہیں اور ان کے لئے ان کے اس فعل پر اجرت نام کا حکم لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام الصوفیہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات میں فرماتے ہیں

وقد وقع لنا التكفير مع

علماء عصرنا ونحن نعدهم
في ذلك لانه ما قام عندهم
دليل على صدق كل واحد
من هذه الطائفة وهم
مخاطبون بغلبة الظن
ومما اعتذروا به قولهم
لو صدقت القوم في كل ما
يدعونه لدخل الخلل في
الشريعة فلذلك سددنا
الباب

ہمارے علماء عصر کے ساتھ واقعہ تکفیر کا
پیش آیا (یعنی لوگوں نے ہماری تکفیر کی،
اور ہم ان کو اس باب میں معذور قرار دیتے
ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس جماعت
(صوفیہ) میں سے ہر فرد واحد کے صادق
ہونے کی کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی (تو
وہ ہر ایک کو صادق کیسے سمجھیں) اور ان
کو (شرعیّت) یہی خطاب ہے کہ غلبہ ظن
پر عمل کریں (اور ان کو غلبہ ظن اسی کا
ہوا) اور منجملہ ان کے عذروں کے ان کا
یہ مقولہ ہے کہ اگر ہم اس جماعت کی تمام
دعووں میں تصدیق کرنے لگیں تو شرعیّت
میں خلل واقع ہو جائے اس لئے ہم نے
سد باب کر دیا۔

قال الشيخ محي الدين ونعم
ما فعلوا ونحن نسلم لهم

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام
خوب کیا اور ہم اس کو ان کے لئے مسلم

ذلك ونصوبهم فيه و
 نحكم لهم بالاجور التام على
 ذلك ولكن اذا لم يقطعوا
 بان ذلك الولي منحط
 في مخالفتهم فان قطعوا
 بخطا فلا عذر لهم فان
 اقل الاحوال ان ينزلوا
 الاولياء المذكورين منزلة
 اهل الكتاب لا يصدقونهم
 ولا يكن بونهم - اهـ

(التبنيہ الطربی مکمل)

مسلم رکھتے ہیں اور اس میں ان کی
 تصویب کرتے ہیں اور اس میں ان
 کے لئے اجر کامل کا حکم کرتے ہیں لیکن
 اسی وقت تک کہ وہ علماء اس بات کا
 قطعی حکم نہ کریں کہ یہ ولی ان کے خلاف
 کرنے میں خطا وار ہے (کیونکہ ان کے
 خلاف کرنے سے کسی نص قطعی کا خلاف
 لازم نہیں آتا جس پر قطعی حکم خطا کا کیا
 جاسکے، اور اگر اس کی خطا کا قطعی حکم
 کریں تو پھر ان کے پاس (اس کا) کوئی
 عذر نہیں رکھنے کی مخالفت میں حکم
 قطعی کر دیا، کیونکہ ادنیٰ حالت یہ ہے
 کہ اولیاء مذکورین کو اہل کتاب ہی کے
 درجہ میں رکھیں کہ ان کی تصدیق کریں
 نہ تکذیب کریں (جیسا کہ حدیث میں
 آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اوپر جو تکفیر
 میں معذور قرار دیا ہے اس سے بھی
 مراد تکفیر ظنی ہے نہ کہ تکفیر قطعی)

اب دیکھئے کہ اس سے زیادہ شریعت اور ہر شریعت کا کیا عظمت
 ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ تو ان کی تکفیر کر رہے ہیں اور یہ حضرات ان کو معذور بلکہ
 ماحوز قرار دیتے ہیں اور ان کے فتویٰ کو تسلیم اور ان کے فعل کی تصویب فرماتے

ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ متشاء ان کے اس حکم کا شریعت کی حفاظت تھی۔
اتباع شریعت اور اہتمام سنت میں ان حضرات کے واقعات بیشمار ہیں
ہم یہاں چند واقعات بیان کرتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ
شریعت کا اہتمام یہ حضرات کس قدر فراتے تھے۔

اتباع شریعت کے واقعات | ۱۱ | دلیل العارفين میں خواجہ قطب
الدین بختیار کاکی کے حوالہ سے خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا ملفوظ نقل کیا

گیا ہے۔
فرمایا کہ ایک وقت ہم اندھ خواجہ اجل بیٹھے تھے نماز مغرب کا وقت تھا۔ خواجہ
تازہ وضو کرتے تھے کہ انگلیوں میں خلال کرنا ان سے سہواً فراموش ہو گیا
ہاتھ غیبی نے آواز دی اور ان کے کان مبارک میں کہا کہ اے اجل ہمارے
رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہو اور ان کی امت سے
کہلاتے ہو ان کی سنت کو تم نے ترک کیا۔ اس کے بعد خواجہ اجل نے قسم کھائی
کہ جس دن سے میں نے ندامتی موت کے وقت تک کوئی سنت رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے متروک نہ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک
وقت خواجہ اجل کو بے حد متروک دیکھا۔ پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا کہ جس
روز سے انگلیوں کا خلال مجھ سے فوت ہوا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ کل کے
روز قیامت میں یہ منہ خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر دکھلاؤں گا
(السنۃ الجلیہ ص ۱۱)

ف۔ دیکھئے خلال کے ترک پر اور وہ بھی سہواً پھر سنت متروکہ بھی
نہیں صرف مستحب۔ تو کس قدر قلق ہوا ہے۔ کیا یہ حضرات شریعت کے

احکام کے تارک ہو سکتے ہیں؟

حضرت نظام الدین اولیاء رافت القلوب میں حضرت خواجہ بابا (۲) فرید الدین گنج شکر رحمہ کا موقوفہ نقل کرتے ہیں کہ بھر شیخ الاسلام نے دعا گو کی طرف منہ کیا اور فرمایا کہ اس راہ میں اصل دل کی حضوری ہے اور دل کی حضوری اس وقت میسر ہوگی جبکہ حرام لقمہ سے بچیکا اور اہل دنیا کی صحبت سے پرہیز کرے گا (صفحہ ۱۹)

ف۔ دیکھئے کھانے پینے میں اور صحبت نیک میں بھی پابندی شریعت کی کس قدر تاکید ہے نیز فرماتے ہیں کہ جو مرد یا شیخ قانون مذہب اہل سنت والجماعت پر نہ ہوگا اور اس کی کیفیت و حالت و حکایت موافق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ نہ ہوگی وہ اس معنی میں راہزن ہے۔

ف۔ کس قدر تصریح کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے مذہب کے اتباع کی تاکید ہے جس سے تمام بدعات کا قلع قمع ہوتا ہے دیکھئے ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کو شریعت کا کس قدر اہتمام تھا۔ ایک واقعہ اور سنت۔

ایک بزرگ کتابا لے ہوئے تھے کوئی عالم صاحب ان کے یہاں تشریف لے گئے انہوں نے کہا کہ حضرت حدیث شریف میں کتابا لےنے کی ممانعت آئی ہے یہ آتا ہے کہ جن گھر میں کتابا ہوتا ہے اس میں رحمت کے فرشتے نہیں داخل ہوتے۔ حالانکہ حدیث شریف میں استثناء بھی آیا ہے یعنی حراست کے لئے یا شکار وغیرہ کے لئے کتابا لےنا جائز ہے۔ بہر حال ان عالم کی زبانی ان بزرگ نے جو یہی یہ سنا۔ کہتے کہ مخاطب کہہ کے کہا کہ جیسا تم یہاں سے چلے جاؤ، مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ بنی صاحب نے کتابا

پلٹنے کو منع فرمایا ہے یہ سننا تھا کہ کتنا اٹھا اور ایک طرف کوچل دیا پھر اس کے بعد کسی نے ان بزرگ کے یہاں اس کو نہیں دیکھا معلوم نہیں کہ کہیں جا کر مر گیا یا کسی دوسرے شہر ہی چلا گیا۔ بہر حال ان بزرگ کا یہ عمل اور ان کی صحبت اور محبت کی وجہ سے کتنے پر یہ اثر قابلِ عبرت ہے۔

(۴) اسی طرح سے انوار العارفین میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات میں ہے کہ حضرت خواجہ کا حال کبھی جمال کا ہوتا تھا اور کبھی جلال کا چنانچہ جب جمال کا غلبہ ہوتا تو اس میں اس قدر مستغرق ہوجاتے کہ اس دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر ہوجاتے۔ پس جب نماز کا وقت ہوتا تو حضرت خواجہ قطبؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت اقدسؒ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر باوازا بلند الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے حضرت کو کچھ خبر نہ ہوتی دوبارہ حضرت خواجہؒ کے کان میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے اس پر بھی ہوش نہ آتا پھر یہ دونوں خدام حضرتؒ کا کاںڈھا مبارک ہلاتے تب آنکھ کھولتے اور فرماتے۔ سبحان اللہ شریعت محمدیؐ سے چارہ نہیں ہے۔ اللہ اللہ کہاں سے کہاں لے آئے یہ فرما کر وضو کرتے اور نماز ادا کرتے۔

ف۔ دیکھئے ایسی مغلوبیت کی حالت میں بھی احکامِ شرعیہ میں کوتاہی نہیں کی! سبحان اللہ!

(۵) اسی طرح سے حضرت شیخ جلال الدین پانی پتیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک بار سکھ کے عالم میں ان کی زبان سے بعض الفاظ سطحیات کے نکلے جب صحو کے عالم میں آئے تو خادموں نے عرض کیا کہ زبان مبارک سے شریعت کے خلاف ایسی ایسی باتیں نکلی ہیں فرمایا کہ خدا

کی پناہ میں تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گیا۔ اس کا کفارہ دینا چاہئے چنانچہ
جاڑوں کی ٹھنڈی ہوا تھی آدھی رات کے وقت دریا نے سندھ کے
کنارہ پر تشریف لے جاتے تھے اور برف کو توڑ کر جو پانی پر جما ہوتا تھا گلے
تک پانی کے اندر ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر دوسرے کو ران پر رکھ کر یہ ذکر
کہتے تھے کہ ”دین محمد قائم دائم۔ دین محمد قائم دائم۔ جاڑے کی شدت
سے تمام بدن چھٹ کر خون بہتا تھا مگر صبح کے وقت پھر غسل کر کے فجر
کی نماز ادا کرتے تھے۔ چھ ماہ تک اس مجاہدہ میں رہے حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے
تسکین بخشی وہ ان بزرگ کا غلیہ حال ہے جو قابل اتباع نہیں ہے تا مگر
سبحان اللہ! کس قدر شریعت کا پاس ادب تھا۔ عظمت شرع
کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
(۶) کے مکتوبات میں ہے کہ شیخ الاسلام شیخ فتح اودھی دین مود
متواتر سماع میں مشغول رہے اور پانچوں وقت نمازیں ادا کرتے رہے
تین دن کے بعد جب سکون ہوا تو احباب نے عرض کیا کہ تین دن گزرے
ہیں۔ دریافت فرمایا کہ نماز ادا ہوئی۔ عرض کیا ادا ہوئی اس کے بعد
شیخ محمد عیسیٰ جو حضرت کے خلیفہ تھے ان کے پاس یہ مسئلہ دریافت کرنے
کے لئے بھیجا کہ یہ نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ شیخ محمد عیسیٰ نے جواب میں لکھا کہ
حقیقت میں نماز تو وہی ہوئی جو حضرت مخدوم نے (اس حالت میں) ادا
کی لیکن شریعت کی رعایت کی وجہ سے دوبارہ پڑھ لیں۔
دیکھا آپ نے ان حضرات کو شریعت کا کس قدر لحاظ تھا۔ حضرت شیخ
کا یہ حال اور ان عالم کا یہ فتویٰ عیدم المثال ہے۔

اسی طرح سیرت الاقطاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ شرف
 الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے لب کے بال بہت بڑھ گئے تھے
 مگر کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ان کو کاٹ دے۔ قاضی ضیاء الدین
 سنائی قدس سرہ جو مکہ شریعت کا جوش دل میں رکھتے تھے ایک ہاتھ
 میں قینچی لی اور دوسرے ہاتھ سے ان کی ریش مبارک پکڑ کر ان کے لب کے
 بال کاٹ دیئے۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد سے حضرت شیخ ہمیشہ
 اپنی داڑھی کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک بار شریعت محمدی
 کی راہ میں پکڑی گئی ہے (اس لئے قابل قدر ہو گئی ہے)
 سبحان اللہ! ان حضرات کو شریعت محمدی کے ساتھ کس درجہ شغف
 و تعلق تھا کہ جو چیز ان کی جانب منسوب ہو جاتی اس کا بھی یہ حضرات اس
 درجہ احترام فرماتے چنانچہ ان کا حال ہی یہ تھا کہ سہ
 نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است۔ انقم بیاتے خود کہ بکویت رسیدہ است
 ہر دم ہزار بوسہ زخم دست خویش را۔ کو دامن گرفتہ بسویم کشیدہ است
 اس نوع کے صداہا واقعات ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
 ان حضرات کے قلوب میں شریعت کی عظمت علماء ظاہر سے کسی طرح کم نہ
 تھی اور یہ لوگ عمل بالشرع میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ثابت ہوئے اس
 لئے کہ صاحب دل ہوتے تھے اور ان کے قلوب اخلاص سے معمور ہوتے
 تھے۔ اس جگہ ہم بس انہیں چند واقعات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔
 آخر میں ایک ضروری بات اور بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ اوپر جو مشایخ
 کے واقعات اتباع سنت کے سلسلے میں بیان کئے گئے ہیں تو مشایخ
 محققین میں سے زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی رہی ہے باقی کوئی کوئی

بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنے عام احوال میں تو صادق ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان سے کوئی ایسا قول یا فعل بھی صادر ہو گیا ہے جس کو شریعت پر مطابق کرنا مشکل ہوا ہے بلکہ بعض تو نصوص شرعیہ کے صریح مزارع معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً دہلی کے کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ رمضان شریف کا مہینہ تھا روزے سے بچے۔ کسی بڑھیا نے شربت کا پیالہ پیش کیا لے کر پی گئے اور یہ فرمایا کہ اس کی وجہ سے ساٹھ روزے کفائے کے لکھے چھ آسان معلوم ہوتے لیکن اس کی دل شکنی گوارہ نہیں ہوئی۔ یہاں بھی اشکال ہوتا ہے کہ مخلوق کی دل شکنی کا تو خیال آیا لیکن حق تعالیٰ کی حکم شکنی کی شناعت نظروں سے اوجھل رہی یہ کب جائز تھا۔

غرض اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جن سے عدم احترام شرع معلوم ہوتا ہے تو اس کے متعلق کلی جواب یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمان اس کا مکلف ہے کہ اپنے اقوال و افعال و احوال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار کرے اور ان سب کو شریعت پر پیش کرے کہ ان کو شریعت کے مطابق کرے۔ شریعت کی نص خواہ اللہ تعالیٰ کی ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب پر مقدم ہے۔ حضرات مجتہدین فرماتے ہیں کہ ان کو اقوالی بخیر الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مقابلے میں میرے قول کو چھوڑ دو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلام العشاق یطوی ولا یروی یعنی اہل محبت اور مغلوب الحال بزرگوں کی باتیں انہیں کے لئے تہ کر کے رکھ دی جاتیں گی ان کی روایت اور

اشاعت نہیں کی جائے گی۔

پس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ عشاق کے حال کو ان کے لئے مسلم رکھا جائے گا اور معذور قرار دیا جائے گا بشرطیکہ دلیل سے ان کا صدق معلوم ہو۔ ایسے حضرات کا اتباع نہ کیا جائے گا۔ اتباع نصوص ہی کا کیا جائے گا۔ ورنہ دین میں بڑا رخنہ پیدا ہو جائے گا۔ بلکہ اسی اصول کے پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ایک بڑا رخنہ پیدا ہو گیا ہے (نعوذ باللہ منہ) اور اس میں شک نہیں کہ جامع شریعت و طریقت ہوتا ہے مشکل کام اور ایک اعلیٰ اور رفیع مقام ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

برکتِ جامِ شریعت برکتِ سندانِ عشق
ہر ہوسنکے نداند جام و سندانِ باختر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

نِسْبَتِ صُوفِي

فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ”القول الجمیل“ میں لکھا ہے کہ نہ

ثم لصاحب المداومة	جاننا چاہئے کہ سکینہ پر مداومت کرنے
على السكينة احوال فرجة	والے کے حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو
تنوبه مرة و مرة	نوبت بہ نوبت اس کو ملتے ہیں لہذا
فليغتنمها السالك وليعلم	سالك کو چاہئے کہ اپنے ان حالات
انها علامات قبول الطاعة	رفیعہ کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ
وتاثيرها في صميم النفس	حالات اس کی طاعات کے عند اللہ
وسويداء القلب	مقبول ہونے اور ان کے باطن نفس

میں اثر کرنے کی علامات ہیں۔ (شفاء العیال ص ۱۵)

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ سکینہ کسے کہتے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ سکینہ کو جانتے ہیں اور نہ صاحب سکینہ کو پہچانتے ہیں اور نہ احوال رفیعہ سے واقف ہیں اور یہ اس لئے کہ آج اس طریق کو لوگوں نے بدنی سمجھ رکھا ہے یعنی یہ

سمجھتے ہیں کہ کسی کو پا جاؤ تو لبس اس کے بدن پر گرو اسی سے کامیاب ہو جاؤ گے باقی اس میں کسی چیز کے جاننے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے میں اس بات کو اکثر کہا کرتا ہوں اس لئے کہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں نے طریق کے علم و عمل کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ پیری و مریدی باقی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کیونکہ مرید تو اسے کہتے ہیں جو اپنی رائے اور ارادہ کو فناء کر کے کسی کامل و مکمل شیخ سے اس لئے تعلق قائم کرے کہ وہ اس کو اس کی رعونت نفس (انانیت) سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا عارف بنائے اور شیخ کے متعلق ابن عربی اپنے زمانہ کا حال لکھتے ہیں کہ :-

ان الزمان مشحون بال دعاوی الكاذبة العريضة
فلا مرید صادق ثابت
القدم في سلوكه ولا
شيخ محقق ينصحه
فيخرج من رعونة نفسه
واعجابه براهه ويعرب له
عن طريق الحق فالمرید
يدعى الشيخوخة والرهاسة
وهذا كله تخبط و
تلبیس :

زمانہ لمبے چوڑے جھوٹے دعووں سے
بھرا ہوا ہے کہ کوئی مرید ہی صادق
اور سلوک میں ثابت قدم نظر آتا ہے
اور کوئی شیخ ہی محقق نظر پڑتا
ہے جو کہ مرید کی غیر خواہی کرے اور
اس کو نفس کی رعونت اور خود رانی
سے نکالے اور طریق حق اس کے
سامنے ظاہر کرے (چنانچہ جب کوئی
شیخ کامل نہیں رہ جاتا تو پھر مرید
ہی شیخوخت اور بڑائی کا مدعی ہو جاتا
ہے اور یہ سب غبط و تلبیس ہے

(آداب الشیخ والمرید ص ۱)

لہذا شیخ محقق جب اس زمانہ میں نایاب تھا تو اب ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں جو کہ پہلے زمانہ سے یقیناً اچھا نہیں ہے شیخ کامل کے وجود کا کیا حال ہوگا پھر جب شیخ کا وجود ہی نہیں ہوگا تو مرید کہاں سے آجائیں گے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں پیر بہت ہیں اور مرید کا پتہ نہیں یا یوں کہہ دیجئے کہ مرید تو بہت ہیں اور پیر کا پتہ نہیں۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے۔

اصل یہ ہے کہ طریق سے جہالت اور دین سے عدم مناسبت (یہ مناسبتی) کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی بھی خبر نہیں کہ طریق میں مقصود کیا ہے اور کون کون سی چیزیں غیر مقصود ہیں۔ اس نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مقصود کو تو چھوڑ ہی دیا اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا۔ اسی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شیخ اور پیر جو کہ وسیلہ اور ذریعہ تھا اس کو مقصود سمجھ لیا گیا اور اس کے بدنی قرب کو کافی سمجھا گیا اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور شیخ جس نور اور دولت کا حامل ہوتا ہے اس کی جانب اصلاً توجہ نہیں رہی۔

طریق کا مقصد اور اس کا منتہا کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے اس کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی کتاب میں نہایت عمدہ کلام فرمایا ہے اسی سے آپ کو سکینت کی تعریف بھی معلوم ہو جائے گی جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا ہے اس لئے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارت نقل کرتا ہوں اس کے بعد اس کی مزید توضیح کروں گا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :-

مرحجہ الطرق کلہا الی	تمام مشائخ کے طرق کا مرجع یعنی
تحصیل ہیئۃ نفسانیۃ	مقصد منتہیٰ اور حاصل ایک ہیئت
تسفی عند ہم	نفسانی کی تحصیل ہے جس کو صوفیہ

بالنسبة لانها انتساب ارتباط
 بالله عز وجل وبالسكينة
 وبالنور وحققتها كيفية
 حالة في نفس الناطقة
 من باب التشبيه بالمملكة
 او التطلع الى الجبروت -
 (القول الجميل)

نسبت کہتے ہیں (سیاں نفسانی
 سے مراد شہواتی نہیں ہے جو کہ روحانی
 کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ نفس سے
 مراد سیاں نفس ناطقہ انسانی ہے
 پس ہیئت نفسانی کا مطلب یہ ہوا
 کہ انسان کے نفس میں حاصل شدہ
 ایک کیفیت اور حالت، اس لئے کہ
 اس کے ذریعہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے
 ساتھ نسبت اور ارتباط حاصل ہوتا
 ہے اسی نسبت کا ایک نام سکینہ ہے
 اور اسی کو نور بھی کہا جاتا ہے اور نسبت
 کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک کیفیت
 کا نام ہے جو نفس ناطقہ میں حلول کر جاتی
 ہے جس کے سبب نفس کے اندر ایک
 ملکیت پیدا ہو جاتی ہے اور عالم بالا
 سے باتیں اخذ کرنے کا ایک ملک پیدا ہو جاتا
 ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارت اور اذکار وغیرہ
 پر مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا
 ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کا ایک
 ملکہ راستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی ملکہ کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے اور حصول

نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہو گئی اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا ورنہ تو حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں :-

اتصالے بے تکلیف بے قیاس

ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال (یعنی نسبت) حاصل ہے جس کی نہ تو کیفیت کا بیان ہو سکتا ہے اور نہ کسی چیز پر اس کو قیاس کیا جاسکتا ہے لیکن اس نسبت کے حصول کے طریقے الگ الگ ہیں اور نسبت بطور قدر مشترک کے سبھی طرق میں پائی جاتی ہے اور وہ ایک ہی ہے جیسا کہ شفاء العلیل میں ہے کہ :-

”حضور مع اللہ رنگ برنگ ہے جس کسی کو جس قدر تعلق اور محبت اور کسر نفس کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ملکہ قویہ حاصل ہوگا اور نسبتیں بیشمار ہیں چنانچہ اشغالِ قادریہ، شیشیہ، اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہے اور اس پر دوام و مواظبت اور اس کے اندر استغراق ہے تاکہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکہ راسخ پیدا ہو جائے“ (تاکہ اس کے بعد پھر غفلت اور ذہول کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور ملکہ کی وجہ احکام شرعیہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے اور ملکاتِ سینہ کا اثر نہیں ہونے پاتا۔)

آگے حضرت شاہ صاحبؒ بطور دفعِ دخل کے یہ فرماتے ہیں کہ سلاسلِ اربعہ میں اشغالِ صوفیہ سے مقصود نسبت کی تحصیل ضرور ہے

لیکن حصول نسبت ان میں منحصر نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

ولا تظن ان النسبة لا تحصل الا بهذه الاشغال بل هذه طريق لتحصيها من غير حصر فيها وغالب الرأي عندى ان الصحابة والتابعين ما نوا يحصلوا السكينة بطرق اخرى فمنها المواظبة على الصلوات والتسبيحات فى الخلوة مع المحافظة على شريطة الخشوع والحضور ومنها المواظبة على الطهارة وذكرها ذم الذات وما اعد الله للمطيعين له من الثواب وللعاصين له من العذاب فيحصل الفكاك عن الذات الحسية والقلاد عنها ومنها المواظبة على تلاوة الكتاب

اور یہ گمان نہ کرنا کہ نسبت مذکورہ کی تحصیل کا ذریعہ محض یہی اشتغال صوفیہ ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشتغال بھی تحصیل نسبت کا ایک طریقہ ہی ہے جس طرح سے اس کے اور بھی طریقے ہیں۔ چنانچہ ظن غالب فقیر کا یہی ہے کہ صحابہ اور تابعین اس نسبت اور سکینہ کو دوسرے طریقہ سے حاصل کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک طریق اس کا یہ تھا کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور خلوت میں تسبیحات کا التزام اور اہتمام فرماتے تھے اور ان تمام امور میں خشوع اور خضوع اور حضور قلب کا خاص خیال رکھتے تھے نیز ایک طریقہ تحصیل نسبت کا یہ بھی تھا کہ (ظاہری و باطنی) طہارات پر مداومت رکھتے تھے۔ اسی طرح سے لذتوں کو توڑ دینے والی چیز یعنی موت کا ہمیشہ استحضار رکھتے تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے مطیعین کے لئے جو اجر و ثواب

والتدبر فيه واستماع
كلام المواعظ وما في
الحدیث من الرقاق
(القول الجلیل)

اور انعام واکرام تیار کر رکھا ہے اور
نافرانوں کے لئے جو عذاب و عذاب
مہیا کر رکھے ہیں ان سب کو برابر
پیش نظر رکھتے تھے جس کی وجہ سے لذت
حسیہ سے وہ بالکل چھوٹ جاتے تھے
اور ان سب چیزوں نے ان کے قلب
سے عیش دنیا کا قلع قمع کر دیا تھا۔
اسی طرح سے ایک طریقہ حصول نسبت
کا پابندی کے ساتھ کتاب اللہ کی تلاوت
اور اس کے معنی میں غور کرنا اور واعظ
و ناصح کی بات پر کان دھرنا اور صمیم
قلب سے اس کا سننا تھا اسی طرح سے
حدیث شریف کے وہ مضامین جن سے
قلوب میں نرمی پیدا ہو ان کا سننا بھی تھا
دیکھئے شاہ صاحب نے طرق تحصیل نسبت کی یہاں کیسی وضاحت
فرمادی یعنی یہ کہ حضرات صحابہ کرام نسبت کی تحصیل ان ہی تمام چیزوں
فرماتے تھے ورنہ عام طور پر یہ غلط فہمی ہو رہی تھی کہ حصول نسبت کا ذریعہ
صرف مشایخ کے اذکار و مراقبات ہی ہیں حالانکہ وہ بھی ایک طریق ہے
اس میں انحصار نہیں ہے۔

اس سے قبل حضرت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ :-

والغرض من الاشغال اشغال صوفیہ سے غرض اسی نسبت کی

تحصیل اور اس پر دوام اور موافقت
 علیہا والاستغراق فیہا
 حتی تکتسب النفس منہا
 ملکہ راسخۃ
 اور اس میں مستغرق رہنا ہے تا آنکہ
 نفس اس موافقت اور دوام سے
 ملکہ راسخہ کسب کر لے۔

اور اس کے بعد آگے چل کر فرماتے ہیں (جہاں ان امور کا ذکر کیا ہے
 جن کے فدیہ حضرات صحابہ و تابعین تحصیل نسبت فرماتے تھے) کہ:۔
 فبالجملة فصحاء
 یواظبون علی ہذا
 الاشیاء مدۃ کثیرۃ
 فتحصل ملکہ راسخۃ
 وھیئۃ نفسانیۃ
 فیحافظون علیہا
 بقیۃ العمر و ہذا
 المعنی ہوا المتوارث
 عن رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم
 من طریق مشائخنا
 لا شک فی ذلک و
 ان اختلف الالوان
 واختلفت طرق تحصیلها
 (القول الجمیل)
 حاصل کلام یہ کہ حضرات صحابہ و
 تابعین اشیاء مذکورہ (یعنی اعمال
 شریعہ پر) ایک کثیر مدت تک موافقت
 و دوام فرماتے تھے جس کی وجہ سے
 ان کے اندر تقرب الی اللہ کا ایک
 ملکہ راسخہ اور ہیئت نفسانیہ حاصل
 ہو جاتی تھی اسی پر یہ حضرات بقیہ عمر
 محافظت فرماتے تھے جس کا اثر یہ ہوتا
 تھا کہ کیفیادہ نسبت اور بڑھتی جاتی
 تھی یہی وہ نسبت ہے جو رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری مشائخ
 کے واسطے متوارث چلی آرہی ہے
 جس میں ذرا بھی شک نہیں۔ اگرچہ
 الوان اس کے مختلف و تحصیل کے
 طریقے رنگ رنگ ہیں۔

اس میں تصریح ہے کہ سلفِ ملکہِ راسخہ حاصل کرتے تھے اور تقبیہ عمر اس پر مداومت کرتے تھے۔ فقط نمازِ روزہ، پر بدون اس ملکہ کی تحصیل کے قناعت کئے ہوتے نہ تھے جیسا کہ اب ہے بلکہ جب تک یہ ملکہ ان کو حاصل نہ ہو جاتا اس کی طلب میں گرما گرمی رہتی تھی اور جب یہ حاصل ہو جاتا تھا تو یہ نہیں کہ ان کو سکون ہو جاتے اور وہ غافل اور سست پڑ جاتیں ایسا نہیں تھا بلکہ اپنے امور باطنی میں اور زیادہ مستعد اور چاق و چوبند ہو جاتے تھے۔

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نہ الا دستور

اس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد ہے

حضرت شاہ صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تحصیلِ ملکہِ راسخہ متواتر اور منقول چلا آ رہا ہے جس طرح کہ نمازِ روزہ بلکہ کل دین منقول چلا آ رہا ہے اور فرمایا ہے ہیں کہ لا شک فی ذلک پس یہ قطعی اور اجماعی مسئلہ ہوا ہر قرن کا اسی سلسلہ میں کہتا ہوں کہ جس طرح یہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل چلی آ رہی ہے اسی طرح سے اخلاق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آ رہے ہیں یعنی آپ کے اخلاق سے صحابہ متخلق ہوئے اور پھر ان سے تابعین اور پھر ان سے تبع تابعین اسی طرح مسلسل لہذا جس طرح نسبت کی تحصیل ضروری ہے اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے اور بتائے ہوئے اخلاق کے ساتھ اتصاف بھی ضروری ہے اور میں تو اس چیز کو بہت دنوں سے سمجھ چکا ہوں بلکہ کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ اس زمانہ میں دین اور دنیا دونوں کی فلاح حاصل کرنے کے لئے بجز تسننِ لسنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

اور کوئی صورت نہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی پر چل کر اور اسے اختیار کر کے آج ہمیں دنیا کی بھی فلاح مل سکتی ہے ورنہ تو اہل دنیا پر فلاح کا دروازہ بند اور عافیت تنگ ہو گئی ہے اور ہوتی جائے گی۔ چنانچہ آج لوگ جو فساد منزل بلکہ فسادِ دینیہ کے فتنوں سے مفتون ہیں اور بہ دیکھ رہے ہیں کہ عوام کس قدر پریشان ہیں۔ خواص بھی اسی طرح سے پریشان ہیں اور اسبابِ راحت کے موجود ہوتے ہوئے بھی سکون معدوم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خدائی عذاب ہے جو مخلوق پر ان کی بد اعمالیوں کی پاداش میں مسلط کیا گیا ہے لہذا اس عذاب اور ان فتن سے خلاصی کی صورت اور تدبیر اور حضرات کے نزدیک جو ہو اس کو وہ جانیں مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا فساد اور نظامِ عالم کی جملہ خرابیوں کی اصل یہ ہے کہ فلاحِ عالم کے خدائی اصول اور صلاحِ عالم کے نبوی طریق کا رشتہ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے اور وہ رشتہ یہی تھا کہ علاوہ دین کے دنیوی امور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سنن کے ساتھ سنن کیا جاتا رہتا ہے اس کے مخاطب وہی حضرات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایما رکھتے ہیں اور آپ کی تعلیمات میں آپ کی تصدیق کرتے ہیں، یہ نقلاً تو ثابت تھا ہی کیونکہ یہ بھی ان امور میں سے ہے جو متواتر چلے آ رہے ہیں علاوہ ازیں عقلاً بھی، ہم آج اپنے حالات میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں نہایت افسوس ہے کہ جو چیز اس درجہ ضروری تھی وہ متروک ہی نہیں بلکہ اس کا انکار ہو رہا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون نماز روزہ باقی ہے اور یہ چیز باقی نہیں خون کے آئینہ اس پر ہلکے جائیں تو کم ہے کیا فقط نماز روزہ ظاہری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آ رہا ہے؟ خشک ہی۔

اس میں یہ برکات نہیں تھے یہ کیا خبر بطور ہے یہ کہاں سے آیا؟ علماء نے اس کی تحصیل کو ضروری نہیں سمجھا اس لئے اس کا علم اور عمل ختم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ حضرات صحابہ حسب مراتب سب کے سب اس نسبت کے حامل تھے اور ان کا باہمی تفاضل اور ان کے درجات کا تفاوت اسی نسبت کے تفاوت سے تھا جسے جس قدر زیادہ اور قوی نسبت حاصل ہوتی تھی اسی قدر وہ افضل اور بلند مرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ نماز و روزہ ان کا عمل ظاہر تھا اور یہ نسبت اس کا باطن تھا اور یہ حضرات اس ظاہر و باطن دونوں ہی کے جامع تھے اب صرف ظاہر دین تو کچھ ہے بھی مگر باطن اور روح ختم ہو چکی ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ اس نسبت کے آوان اور طرق مختلف ہوتے ہیں تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سلف میں اس نسبت کی تحصیل کا طریق احکام شرعیہ کی پابندی تھی اور خلف میں اشغال وغیرہ اس کے لئے مقرر ہوئے مگر احکام شرعیہ ہر حال میں مقدم ہے۔

یعنی حضرات صحابہ تو اس نسبت کو مواظبت علی الصلوٰۃ و تسبیحات اور مواظبت علی الطہارۃ، مراقبہ موت اور ثواب مطیعین اور عذاب عاصیین کے استحضار وغیرہ سے حاصل کرتے تھے اور بعد کے مشائخ نے لوگوں کی استعداد کو ضعیف پایا اور یہ دیکھا کہ محض ان امور کے کرنے سے اب یہ نسبت حاصل نہیں ہو رہی ہے تو انہوں نے اشغال و مراقبات کا اضافہ کر دیا۔ اور ان کے ذریعہ نسبت پیدا کرنی چاہی یہ تو طرق کا اختلاف ہوا۔ اور آوان کا اختلاف یہ تھا کہ مثلاً کسی نسبت میں محبت و شوق کا غلبہ ہوا

اور کسی میں خوف کا کسی میں قناء کا غلبہ رہا اور کسی میں بقاء کا تو بظاہر نسبت کے یہ سب الوان مختلف معلوم ہوتے تھے لیکن ان سب ہر ہر سالک کے اندر وہی حالت پیدا کر دی جس کا نام نسبت تھا چنانچہ جس میں محبت اور شوق کا غلبہ ہوا اس نے بھی معصیت کو ترک کیا اور اپنے تمام امور میں حق تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھی اور جس کے اندر خوف کا غلبہ ہوا اس نے بھی معاصی سے نفرت اور طاعت سے رغبت کی، یہی حال اور دوسرے الوان کا بھی ہوا۔ پس اس اختلاف کے باوجود مرجع سب کا واحد یہ رہا یعنی ارتباط باللہ تعالیٰ، جس کی تحصیل سب پر لازم تھی اور ہر شخص پر ضروری تھی ان اشغال کے ذریعے نسبت کی تحصیل اور اس پر موانعت اور اس میں استغراق اس درجہ کہ نفس ملکہ راستہ کا کسب کر لے اس لئے ضروری ٹھہری کہ جب نفس کو ملکہ راستہ حاصل ہو جائے گا تو چہر غفلت اور ذہول کی گنجائش باقی نہ رہ جائیگی اور اسی میں اس کی خیریت بھی ہے۔ کیونکہ اگر ان اشغال کے ذریعے ملکہ خبیثہ کا کسب نہ کیا گیا جس سے کہ طاعت میں سہولت اور معصیت سے نفرت ہو جائے تو اشغال دنیویہ میں اہنماک کے سبب نفس ملکہ خبیثہ ستیدہ کسب کر لے گا جس سے نجات ملنی دشوار ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ یہ ظاہری طاعات (یعنی نماز روزہ) بھی اس کو اس نہ نکال سکیں گی۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ سب طاعات بھی کرتا رہیگا اور دوسری جانب اس کے نفس میں یہ ملکہ خبیثہ موجود رہیگا جس سے خلاصی آخرت ہی میں ہو سکے گی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے نسبت کی توضیح اور اس کی ضرورت آپ کو معلوم ہو گئی، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسی نسبت کا دوسرا نام سکینہ بھی ہے یہ مشائخ کی اصطلاح ہے باقی علماء ظاہر بھی جو معنی نسبت، سکینہ کے بیان

کرتے ہیں وہ اسی کے قریب قریب ہے چنانچہ صاحب روح المعانی فانزل
 اللہ سکینتہ کے تحت لکھتے ہیں کہ وہی الطمانینۃ الّتی یسکین
 عندھا القلوب یعنی سکینہ اس اطمینان کا نام ہے جسے پا کر قلوب تسکین
 حاصل کریں۔ اور پھر کچھ دور کے بعد باب الاشارة میں لکھتے ہیں کہ

ثم انزل اللہ سکینتہ حق تعالیٰ کے ارشاد ثم انزل اللہ سکینتہ
 علیٰ رسولہ وعلیٰ المؤمنین میں جو علیٰ رسولہ وعلیٰ المؤمنین
 سکینہ آیا ہے اس کے متعلق بعض عارفین یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم کا سکینہ آپ کا مشاہدہ ذات تھا اور مؤمنین کا سکینہ صفات کا
 معاینہ تھا یعنی آپ اس حالت میں حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدہ سے
 ملنے لگے اور مؤمنین اللہ تعالیٰ کی صفات کا مراقبہ کر کے مطمئن تھے۔

اُگے فرماتے ہیں کہ:-

مشائخ کے سکینہ کی تعریف کے بیان میں مختلف تعبیرات ہیں عنوان مختلف ہیں
 لیکن معنی اور معنوں قریب قریب کا ایک ہی ہے چنانچہ ایک قول یہ ہے
 کہ سکینہ اس قوت قلبیہ کا نام ہے جس میں اطمینان کی آمیزش ہو۔ حق تعالیٰ

ولہم فی تعریف السکینۃ عبارات کثیرۃ متقاربۃ المعنی فقیل ہی استحکام القلب عند جریات حکم الرب بنعت الطمانینۃ لخمود

اُثار البشریة بالکلیة
والرضا بالبادی من
الغیب من غیر معارضة
واختیار :-

کے حکم سننے کے وقت اور اس کی
وجہ سے انسان کے بشری تقاضے بالکلیہ
سوخت ہو جائیں اور پردہ غیب سے
جو چیز بھی ظاہر ہو بغیر کسی معارضہ کے اور
بدون اپنا اختیار چلاتے ہوئے انسان
اس پر راضی ہو۔

وقیل ہی القرار علی
بساط الشہود ولبشواہد
الصحو والتأدب باقامة
صفاء العبودیة من
غیر لحوق مشقة و
لا تحريك عرق بمعارضة
حکم وقیل ہی المقام
مع الله تعالى بفناء
الخطوط :-

اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے
کہتے ہیں کہ انسان اپنے پورے ہوش و
حواس کے ساتھ حق تعالیٰ کے مشاہد
کی بساط پر فائز ہو اور خالص عبودیت
کی اقامت کے ادب سے متادب ہو
اس طرح کہ اس کو ان کی ادائیگی میں
نہ تو کچھ تعجب ہو اور نہ کسی حکم سے معارضہ
کی رگ مچھڑے اور ایک قول یہ ہے
کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے
خطوط کو قناء کر کے بقاء باللہ حاصل
کر لے۔

(روح المعانی ص ۹۲ ج ۱۰)

اور جس طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرات صحابہ و تابعین کے
سلوک کا طریقہ اور تحصیل نسبت کے طرق اور ان کی تفصیل بیان فرمائی ہے
اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہیؒ نے بھی نسبت احسان کے معنی بیان
کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

» ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر موجود جان کر حیا و شرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے اور باقی زوائد «

اسی سلسلہ میں آگے صحابہ و تابعین کا سلوک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

» سنو ! کہ سلوک صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں تحصیلِ احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجہ محتاج ذاتِ غنی کا اور حضور اس کردار بے نیازِ محسن عباد کا ہونا تھا۔ بندگی و بندگی عجز و درعجز، توکل و توکل۔ ہمت اطاعت، و جان و مال کی بازی فی ضیاء المولیٰ اس کا ثمرہ تھا۔ نہ استغراق تھا نہ قناء تھی۔ متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربطِ حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ سو بعدِ مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے انہیں تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے موجود ہیں بوحادث وجود یا بوحادث شہود علی خلافِ بینم۔

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہاءِ راہِ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے پس جذب کے معنی رجوع السالک الی حقیقۃ الحقائق و اصل الاشیاء۔ اور اس میں افتاء اپنا اور اپنے علمِ انانیت کا کہ دینا مقرر ہوئے۔

اس راہِ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے گو یادہ کمالات اب کا اعتناء ہو گئے جس طرح سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے ہنوز اس کے آثار کے

سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ان کا تہ وصلہ و ملکہ ملا
اعلیٰ سے ناشی تھا اب ملاء اسفل سے بھی پوری مناسبت نہیں
مع ہزارہ جذب رہے نہ درگاہ (یعنی جذب طریق ہے مقصد نہیں)
اس لئے بعد طے ماہ جذب کے وہی طریقہ صحابہ کہ عبدیت کا مقام
ہے اختیار کرنا و عبادت و عاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے“

(مکتوبات رشیدیہ ص ۷۲)

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سلوک
کی جو تفصیل بیان فرمائی بہت خوب رہے اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔
بلاشبہ حضرات صحابہ کرام رحمہ کا یہی حال تھا۔ لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ
وہاں نہ استغراق تھا نہ فنا تھی تو اس کی کچھ توضیح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ
صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فنا متاخرین کو حاصل ہوا حضرات صحابہ
کافنا اس قسم کا نہ تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ حضرات فنا
سے عاری تھے ایسا نہیں تھا ان حضرات نے بھی اپنے آپ کو کامل طور پر
فناء کر دیا تھا۔ لیکن ان کے فنا میں سکون نہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور
مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا۔ پورے فانی اور
پوری طرح باہوش۔ اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے
فنا میں سکون کا اندازہ تھا۔ آپ کے سامنے صحابہ کے فنا کی ایک مثال بیان
کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حضرت زید بن حارثہ جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
کے متبنی تھے ان کا نکاح حضرت زینب کے ساتھ ہوا تھا لیکن مزاج
کی موافقت نہ ہوئی اور حضرت زید نے حضور سے شکایت کی اور کہا کہ

میں ان کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس نے میری خاطر سے اور اللہ اور رسول کے حکم سے تم کو اپنی طبیعت کے خلاف قبول کیا ہے اس لئے اب چھوڑ دینے کو وہ اور اس کے عزیز اپنی دوسری دولت سمجھیں گے اس لئے خدا سے ڈرو اور جہاں تک ہو سکے بناہ کی کوشش کرو لیکن موافقت نہ ہونی تھی نہ ہوتی اور آئے دن جھگڑے اور قیصے پیش آتے رہے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ جاہلانہ رسم یعنی اپنے لے پالک کی بیوی کے ساتھ نکاح نہ کر سکتا اس کو اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے عملی طور سے ہدم کر دے تاکہ مسلمانوں کو آئندہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا تو حش باقی نہ رہے اس لئے جب زید نے ان کو طلاق دے دی اور عدت گزر گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان ہی پر کر دیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا بِكَيْلًا لِّيَكُونَ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيْ اَزْوَاجِ اَدْعِيَائِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ
وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

یعنی پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے نکاح کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں اور خدا کا یہ حکم تو ہو والا تھا ہی۔ (بیان القرآن ص ۱۵۴)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ حضرت زینبؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو یہ آیت سنائی اور پھر اس کے بعد ان کا شمار ازواجِ مطہرات میں ہونے لگا۔

یہ واقعہ صحابہ کرام کے سامنے پیش آیا اور اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب واقعہ تھا مگر وہ حضرات اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اس طرح فنا کر چکے تھے کہ اس کے متعلق زبان سے کچھ کہنا تو درکنار کسی کو خطرہ اور وسوسہ کے درجہ میں بھی کوئی خیال نہیں گذرا۔ اس کی کوئی نظیر غیر صحابی میں تو مل ہی نہیں سکتی اب اس سے بڑھ کر کیا فنا ہوگی کہ اپنی رائے کو اللہ اور رسول ﷺ کی رائے اور ارادہ کے بالکل تابع کر دیا تھا اور فناء سے مراد حضرات مشائخ کی بھی ارادہ ہی کا فنا ہوتا ہے یا رد اہل کا فنا ہوتا ہے چنانچہ یہاں ان دونوں ہی کا بے مثال ثبوت موجود ہے۔

اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جذب (یعنی نسبت بمعنی یہ بیان فرماتے ہیں کہ رجوع السالك الى حقيقة الحقائق و اصل الاشياء اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ اس میں افتاء اپنا اور اپنے علم و انانیت کا کہ دینا مقرر ہوئے۔ نہایت عمدہ بات فرمائی۔ بلاشبہ نسبت میں فناء علم اور فناء ارادہ تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلقات سے بھی دل سرور ہو جاتا ہے اور سالک کا مطلوب صرف ذات باری تعالیٰ اور رضائے باری تعالیٰ ہو جاتا ہے اس مضمون کو حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ خلف الرشید حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ نے اپنے مکتوبات میں خوب خوب بیان فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ طریق کو سالک کی نگاہوں میں محبوب کر دینے اور اس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے اور حق تعالیٰ کی طلب میں سالک کو کھڑا کر دینے کا ان بزرگ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فنا کے مضمون کو تو اس دلکش عنوان

سے بیان فرماتے ہیں کہ بس انسان کم سمیت کس کم میدان میں کو دہی پڑے۔
چنانچہ مکتوب لبست دوم مکتوبات جلد سوم میں صوفیائے کرام کے طریق کی
مدح فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ :-

اللہ تعالیٰ بجمعیت و عافیت دارد
وہر جادہ شرع محمدی علیہ السلام
وسنت احمدی مستقیم و مستقیم
گرداند و از تعلقات دنیا و گرفتاری
ماسوا محرر ساختہ در سادات معرفت
و سرپردہ قرب خویش انس و
القت دہد۔ این معنی در عالم
اسباب و البتہ بسلوک طریقتہ
صوفیہ عالیہ است۔ ایں بزرگوار
در محبت حق جل و علا از خود و از
غیر خود گستہ اند و در عشق او
از آفاق و انفس گذشتہ
ماسوا را در راہ او در باختہ و یا و
ساختہ اند اگر حاصل دارند اورا
دارند اگر واصل اند با و واصل
اند باطن شان را بہیچ انقطاع
از دین او تعالیٰ روئے دادہ است
کہ اگر سالہا یا داسوا نمایند۔ بیاد

اللہ تعالیٰ تم کو جمعیت خاطر کے ساتھ تقابلاً
رکھے اور شریعت محمدی اور سنت احمدی
علیہ السلام پر مستقیم و مستقیم رکھے اور دنیوی
تعلقات سے دور اور ماسوی اللہ کے
علاقہ سے نفور رکھے اور اپنے قرب معرفت
کے سراپردہ کے ساتھ انس و محبت بخشے رہے
سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قرب خاص جن
کا نام نسبت ہے، یہ چیز اس عالم اسباب
میں حضرات صوفیہ علیہم السلام کے طریق پر
چلنے سے حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ ان
بزرگوں نے حضرت حق جل و علا کی محبت
میں نہ اپنے کو دیکھا اور نہ غیر کو بلکہ سب
ایک لخت خالی ہو گئے اور عشق مولیٰ
میں اپنے نفس کو بلکہ سارے ہی جہاں
کو چھوڑ دیا اور ماسوی اللہ کو اللہ کے
راستہ میں خیر یاد کیا کہ خود کو ان کے ساتھ
واصل کر لیا۔ اس طرح سے کہ اب اگر
کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی سے تعلق

رکھتے ہیں اور کسی واسل ہیں تو اسی سے
 واسل ہیں چنانچہ ان حضرات کے باطن
 کو ماسوی اللہ سے ایسا انقطاع کلی
 ہو جاتا ہے کہ اب اگر ماسوی کو سالہا
 سال یاد کریں تب بھی یاد نہ آئے اسی
 طرح سے نفس کی انانیت اور عنوت
 ایسا نکل جاتے ہیں کہ اب اس کے بعد
 لفظ انا کا استعمال بھی ان کو شرک
 معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں
 نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد باندھا تھا اس
 کو سچ کر دکھایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں
 تجارت اور بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر سے
 مشغول نہیں کرتی۔ خداوند تو مجھے بھی
 اسی قوم میں سے کر دے یا کم از کم ان
 کی زیارت کرنے والوں ہی میں سے
 بنا دے کیونکہ ان دو کے علاوہ تیسری قوم
 میں ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اب
 جو شخص کہ طریق میں داخل ہونے کی
 ہوس رکھے اور طلب خدا کے خیال کا بیج
 اپنے دل میں بونا چاہے تو اس کو لازم ہے
 کہ تمام چیزوں کو ترک کر کے مشایخ طریق

شاں نیابت و از انانیت نفس بوع
 گذشتہ اند کہ عود کلمہ انار بر خود
 شرک می دارند رجال صدقوا
 ما عاهدوا اللہ علیہ و رجال
 لا تلہیم تجارت ولا بیع
 عن ذکر اللہ "خداوند مرا
 ازین قوم بگرداں یا از نظر گیان
 این قوم بگرداں کہ قوم دیگر طاقت
 ندارم
 ہر کس کہ ہوس این راہ دارد تو
 این اندیشہ در دل می کار دیا بد کہ
 ہمہ چیز را گذشتہ صحبت این اکابر
 اختیار نماید و جاں نثار لوازم طلبکاری
 کند و از ہر جا بوسے ازین دولت
 بمشام جاں برسد از پتے آں شود
 خوش گفت بود سے

بعد ازین مصلحت کار در این مہینم
 کہ روم بردر میخانہ و خوش نشینم

مکتوبات ص ۴۳
 ج ۳

کی صحبت اختیار کرے اور لوازم طلب
 کے آگے اپنی جان نثار کر دے اور جن جگہ
 سے بھی اس دولت کی خوشبو اس کے
 مشام جان میں پہنچے اس کی تحصیل کے
 درپے ہو جائے کسی نے خوب کہا ہے
 اب اس کے بعد مصلحت کا اس میں
 سمجھتا ہوں کہ رے خانہ کے دروازے پر
 جا پڑوں اور خوشی خوشی وہیں ایام گزار
 دوں - وقیل فی ہذا المعنی
 مصلحت دیدن آنست کہ یاراں ہمہ کار
 بگزارند و خم طرہ یاری گھیرند
 ایک دوسرے مقام پر قبض و بسط پر جو کہ سالک کے احوال میں سے ہیں اور
 طریق کے ارکان میں سے ہیں کلام کرتے ہوئے نسبت کے متعلق فرماتے ہیں کہ
 کبھی اس کا ضعف سالک کے قبض کا سبب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-
 گاہ بود کہ ایں بستگی بجهت ضعف
 نسبت باطن باشد و چون نسبت
 قوت پیدا نہ کرده است گاہے ظہور
 می کند و گاہے مستور می شود
 در حالت بعد صوری و غیبت از مر
 پیش ادملکہ نشدن نسبت ایں
 ضعف روتے می دہد و علاج
 کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قبض کا منشاء
 نسبت باطنی کا ضعف بن جاتا ہے
 کیونکہ نسبت جب قوی نہیں ہوتی تو
 کبھی اس کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی وہ
 مستور ہو جاتی ہے بالخصوص اس حالت
 میں جب کہ اپنے شیخ سے صوری اور ظاہری
 بعد بھی ہو چنانچہ جب تک نسبت کا مروج

اُس صحبت را مہر است و توجہ اور
تائید قوت پذیرد و ملکہ شود
و بسر حد فناء رسد
و مکتوبات معصومیہ (۱۶۲)

نہ ہو جائے یعنی وہ ملکہ نہ بن جائے۔
اس سے پہلے شیخ سے جدائی اس قسم
کے ضعف کا سبب بن جاتی ہے یعنی
جب شیخ کی خدمت میں رہیگا تو نسبت
میں قوت محسوس ہوگی اور جدا ہونے
میں اس میں ضعف ہو جائے گا اس کا
علاج مہر کامل کی صحبت اور اس کی
توجہ ہے تاکہ نسبت قوی ہو کہ ملکہ اسخہ
ہو جائے اور سالک فناء کی حد تک
پہنچ جائے۔

اس کے بعد توجہ شیخ اور صحبت کامل کو مدار کار (یعنی حصول نسبت
اور ذریعہ تقویت نسبت) قرار دے کر اس پر نہایت ہی زور دار کلام کیا ہے
اور یہ بتایا ہے کہ نسبت کسی صاحب نسبت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ
فرماتے ہیں :-

توجہ مرشد در صورت ثانیہ
کہ بواسطہ زلت ظلمت ظاری شدہ
باشد نیز نافع است توجہ بمرکب کامل
کوہ کوہ ظلمات و کدورت و ادھر
راہ کہ پیدا شدہ باشد از مرید صادق
برمیدارد و تطہیر باطن او میفرماید
و در قبض نیز اس توجہ سودمند است

مرشد کامل کی توجہ دوسری صورت میں
بھی یعنی جبکہ کسی معصیت یا لغزش کے
سبب نسبت میں تاریکی آجائے نافع
ہوتی ہے اس لئے کہ شیخ کامل کی
توجہ ایسی چیز ہے کہ اگر ظلمت و کدورت
کے پہاڑ کے پہاڑ ہر طرف سے
نمودار ہو جائیں تو ان کو بھی مرید صادق

نمودے در بسط می آرد و راه ترقی
را بروے می کشاید۔

سے دفع کر کے اس کے باطن کی تطہیر
کر سکتی ہے۔ اسی طرح سے شیخ کی توجہ
سالمک کے لئے حالت قبض میں بھی
مفید ہے چنانچہ بہت جلد اس میں بسط
پیدا کر کے ترقی کا راستہ اس پر کھول
سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مدار کار وہ محبت
اور وہ توجہ ہے جو کہ محبت یعنی عقیدت اور
سپردگی کے ساتھ جمع ہو جائے یعنی
سالمک کی جانب سے محبت اور حوالگی ہو
ادب شیخ کی جانب سے توجہ۔

چنانچہ تنہا محبت بدون توجہ شیخ کے
بھی رہبرین سکتی ہے یعنی نافع ہو سکتی
ہے اور ترقی دے سکتی ہے مگر محض
توجہ شیخ بدون محبت طالب کے کچھ زیادہ
نفع بخش نہیں

یہ محبت ہی کا کہ شمع ہے کہ وہ تنہا
شیخ کی توجہ باطنی کو جذب کر لیتی ہے
اور اس کے مخصوص کمالات کو اپنی
جانب کھینچ لیتی ہے اور فنا فی الشیخ
بلکہ فنا فی اللہ کا مقام حاصل کر اوتی

و بالجملہ مدار کار بر محبت و توجہ است
کہ با محبت و سپرد جمع شود از یک
جانب محبت و سپرد و از جانب دیگر
توجہ۔

محبت تنہا بے توجہ را بہر
می تواند کہ نافع شود و ترقی بخشد
اما توجہ محض بے محبت قلیل النفع
است۔

محبت است کہ معانی خفیہ
پیر را جذب می نماید و کمالات مخصوصہ
اور انجود می کشد و فنا فی الشیخ بلکہ
فنا فی اللہ پیدا می آرد و چوں از طرفین
صفات مذکورہ پدید آید امید است

کہ راہ ترقی کثادہ رشود و بزودی
ہے اور اگر صفات مذکورہ یعنی محبت و توجہ
جانبین سے ظاہر ہوتی ہیں تو اب حصول
نسبت کے بعد امید قوی ہو جاتی ہے
کہ ترقی کا راستہ کھل جائے اور جلد ہی
منزل مقصود تک رسائی ہو جائے اور
سالک راستہ ہی میں نہ رہ جائے

۱۶۵ ص

پھر آگے کچھ دور کے بعد لکھتے ہیں کہ:-

پس باعث توقف سالک
وسلہ راہ اور دریں طریق ہیچ
نشد غیر از سستی طالب طالب
صادق کہ در صحبت کامل افتد و شرائط
طلب کہ اکابر قرار دادہ اند بجا آورد
امید است کہ البتہ واصل گردد۔
(مکتوبات معصومیہ ص ۱۶۶)

پس اس طریق میں سالک کے توقف کا
سبب اور اس کے حق میں مانع اور سبب
کوئی اور چیز نہیں ہے بجز سالک کی
سستی کے چنانچہ جو طالب صادق
کسی کامل کی صحبت میں پہنچ جائے
اور وہ تمام شرائط بجالاتے جنہیں اکابر
طریق نے مقرر کیا ہے تو امید ہے کہ ضرور
بالفرد واصل ہو جائے۔

اس میں اس امر پر تنبیہ فرمائی کہ شیخ کامل کو پا کر بھی اگر سالک کامیاب نہیں
ہو رہا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ خود اس کے اندر کوئی علت اور مانع موجود ہے۔
اور علی العموم وہ مانع طالب کی کاہلی اور سستی اور اس کا شرائط طلب نہ بجالانا
ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر سلوک کا مقصور بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-
مقصودانہ سیر سلوک شیخی و مریدہ فتن سیر و سلوک سے مقصود پیر نانا اور مرید نانا

نہیست مقصود ازالہ اداۓ وظائف نہیں ہے بلکہ وظائفِ بندگی کا اس
بندگی است یہ مناد عت نفس طرح سے ادا کرنا ہے کہ نفس کی آمیزش
اور منازعت باقی نہ رہے۔

و نیز مقصود نیستی و گنہامی است و زوالِ رعونت و انانیت امارہ کہ
اسی طرح سے طریق کا مقصود نیستی اور معرفت بدان مربوط است ہر کہ
گنہامی کی تحصیل اور نفس کی سرکشی بایں کس رجوع می کند و انابت
اور خود رانی کہ دور کرنا ہے اس لئے می آید اور از حق بازداشت بخود
کہ معرفت کا حصول اسی کے ساتھ قائم مشغول می سازد و ہر کہ رجوع نمی آرد
ہے اور جب ایسا ہے تو جو شخص ایسے اور باحتی می دارد و ممنون او بایستد

شخص کی جانب رجوع ہو اور اس سے تعلق کا اظہار کرے تو اس نے گویا اس کو
حق تعالیٰ کی جانب سے پھیر کر اپنی جانب
مشغول کر لیا اور جو شخص ایسے شخص
کی جانب رجوع نہیں کرتا تو وہ اس کو
حق تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا موقع دیتا
ہے لہذا اس کا شکر گزار ہونا چاہئے

لے اللہ تو ہماری مخلوق کو مجھ سے برتر ہے
کر دے۔ ایسا کہ وہ میری جانب رخ ہی
نہ کریں اس طرح سے مجھے تمام دنیا والوں
سے یکسو فرمادے۔ اور میرے دل کو ہر طرف
سے پھیر دے۔ اور اپنے عشق میں مجھے
یکسو اور ہمہ تن متوجہ فرمادے۔

یارب ہمہ خلق را بمن بد خو کن
و از جملہ جهانیان مرا یک سو کن
روئے دل من صرف کنی از ہر جہت
در عشق خودم یکجہت و یک سو کن

ر مکتوباتِ معصومیہ ص ۶۵

اس مکتوب میں حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ نے اس امر پر تنبیہ فرمائی ہے کہ سیر و سلوک کا مقصود یہ نہیں ہے کہ سالک بس پیری مریدی کرنے لگے اور اسی کو سلوک کا منہتی سمجھ لے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کی منازعت و انانیت کو ترک کر کے وظائف بندگی کو ادا کرے اور حقوق عبودیت کو بغیر مشارکت نفس کے انجام دے۔ چونکہ وظائف بندگی و عبودیت کا ذکر آگیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ وضاحت کی جائے تو اس کے شیخ ابو سعید کا کلام نقل کیا جاتا ہے و هو هذا۔

شیخ ابو سعید فرمودہ کہ سمعت
الشیخ ابا الفضل محمد
بن الحسن شیخ وقتہ اللہ
لا یدکر والمستقبل لا ینظر
و ما فی الوقت یعبر و هذا
صفة العبودیۃ ثم قال
حقیقۃ العبودیۃ شان
الافتقار الی اللہ تعالیٰ و هذا
من اصل العبودیۃ و حسن
القدوة برسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم و هو الذی لیس
فی النفس نصیب ولا
راحة۔

حضرت شیخ ابو سعید نے فرمایا کہ میں
نے شیخ ابو الفضل محمد بن حسن سنا جو کہ اپنے
وقت کے شیخ تھے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ
گذرے ہوئے کو یاد نہ کرنا چاہئے اور آئندہ
کا انتظار نہ کرنا چاہئے بس موجودہ حال کا
اعتبار کرنا چاہئے اور اس کو غنیمت
سمجھنا چاہئے اور یہی عبودیت کی صفت
ہے پھر یہ فرمایا کہ عبودیت کی حقیقت دو
چیزیں ہیں ایک تو افتقار الی اللہ تعالیٰ ہے
اور یہی اصل بندگی اور اس کا اہم جزو ہے
اور دوسری چیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی اتباع کرنا نہایت حسن و قوی
کے ساتھ یعنی اس مقصود امتثال اور
فرمانبرداری ہو، نفس کا حفظ اور اس کی

راحت مطلوب نہ ہو۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھئے کہ ہر شے کی ایک صفت ہوتی ہے اور اس کی ایک حقیقت اور ماہیت ہوتی ہے۔ صفت ایک خارجی چیز ہوتی ہے اور وہ چیز اسی صفت سے پہچانی جاتی ہے۔ صفت ذات سے منفک ہوتی ہے اور حقیقت عین شے ہوتی ہے جو کبھی منفک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ذاتیات کا ذات سے انفکاح محال ہوتا ہے جب یہ بات سمجھیں اگئی تو اب سنئے کہ عبودیت کی صفت یہ ہے کہ عباد ماضی و مستقبل سے قطع نظر کر کے مافی الوقت کا وظیفہ خواہ وہ جو ارجح سے متعلق ہو یا قلب سے، ادا کرتا ہے۔ یعنی عبادات، معاشرت، معاملات، اخلاق، غرضیکہ جملہ طاعات میں سے جس کا وقت آئے اس کو فوراً ادا کر لے۔ اگر کبھی کہیں لغزش ہو جائے فوراً توبہ کر لے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق نیست فردا گفتنش شرط طرقتی اس کی مزید وضاحت اس عبارت سے ہوتی ہے کہ :-

حالات کی چار قسمیں ہیں نعمت، مصیبت، طاعت، معصیت، اس لئے کہ بندہ ان چار حالتوں میں سے کسی نہ کسی حال میں ضرور ہوگا۔ یا تو نعمت میں ہوگا یا مصیبت میں، یا عبادت میں یا معصیت اور ان چاروں حالتوں کے جو حقوق ہیں وہ حقوق اوقات کہلاتے ہیں۔ نعمت کا حق شکر، مصیبت کا حق صبر، عبادت و طاعت کا حق اللہ تعالیٰ کے فضل کا مشاہدہ، اور معصیت میں توبہ و استغفار و ندامت، پس کوئی وقت ایسا نہ نکلے گا کہ اس میں بندہ کے ذمہ حق نہ ہو، تو اگر یہ حقوق قضا ہو جاویں تو ان کی قضا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ قضا کی حقیقت تو یہ ہے کہ عبادت کا جو اصلی وقت ہے وہ فوت ہو گیا ہے اب ہم اپنے پاس سے وقت خرچ کر کے اس عبادت کو ادا کریں اور یہاں یہ صوفی

ممکن نہیں اس لئے کہ جس وقت کو تم نے ان حقوق کی قضاء کے لئے تجویز کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا حق جدید اور امر محکم یعنی عبادت لازم ہے۔ اس لئے کہ اس وقت میں بھی چار حالتوں میں سے کوئی حالت ہوگی اور حقوق وقت میں سے کوئی حق اللہ کا مثل سبر و شکر وغیرہ کے اس میں بھی لازم ہوگا اور جب اللہ کا حق جو اس وقت کے متعلق ہے تو اس میں ادا نہیں کر سکا تو غیر کا حق جو اس وقت کے سوا جو دوسرا وقت گذر گیا ہے جس کا وقت تو نے فوت کر دیا ہے اس کا حق اس وقت میں کیسے ادا کر لیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت کے اندر تم نے پہلے وقت کا حق قضا کرنا تجویز کیا ہے اس وقت کا بھی تو حق ہے جب تم اس کو ادا کرو گے تو غیر وقت کا حق اس میں کیسے ادا کر سکتے ہو اور اگر غیر وقت کا حق ادا کر دو گے تو اس وقت کا حق فوت ہو جائے گا۔ غرض اس کی قضا کسی طرح ممکن نہیں۔ پس بندہ کو لازم ہے کہ حق وقت کو فوت نہ کرے بلکہ سانس پر حق وقت کو ادا کرتا رہے۔ اگر نعمت ہے تو شکر میں قلب کو مشغول کر لے اور اگر مصیبت ہے تو صبر میں لگے اور اگر عبادت و طاعت ہے تو اللہ کے فضل و احسان کا مشاہدہ کرے اور اگر معصیت کی حالت ہے تو ندامت اور استغفار میں مشغول ہو۔ اسی واسطے بزرگوں نے کہا ہے کہ صوفی ابن الوقت ہوتا ہے اور ابن الوقت ہونے کے ہی معنی ہیں کہ حقیق وقت ادا کرے۔ (اکمال الشیم ص ۲۸)

یہاں تک تو گفتگو صفت عبودیت سے متعلق تھی اب حقیقت عبودیت کو سمجھئے وہ یہ کہ یوں تو بندہ ہمہ وقت ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے ہی۔ یعنی کھانے میں، پینے میں، چلنے میں، پھرنے میں، صحت میں، مرض میں، لیسر میں، عسر میں، غرض کہ ہر ہر قدم پر اس کو افتقار ہے، اسی افتقار کا ہمہ وقت استحضار ہی حقیقت عبودیت ہے، افتقار و احتیاج تو سبھی لوگوں کو ہوتی

ہے مگر غافلین و منکرین کو اس کا استحضار و اعتراف نہیں ہوتا اس لئے وہ حقیقت عبودیت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہمہ وقت ہر چیز میں اپنے کو اللہ کا محتاج سمجھتے ہیں اس لئے ان کو حقیقت عبودیت حاصل ہے اس حقیقت عبودیت کا دوسرا جز حسن القدوة برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جز اول یعنی افتقار الی اللہ اس آیت سے ماخوذ ہے یا ایہا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ هو الغنی الحمید یعنی اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز خوبول والا ہے۔

اور دوسرا جز اس آیت سے ماخوذ ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنة۔

صاحب کشف نے اس کی دو تفسیریں فرمائی ہیں ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں اسوۃ حسنہ ہے یعنی آپ کی ذات بابرکات ہر اعتبار سے متوسل اور مقتدا ہے اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ آپ میں ایک ایسی خصلت ہے جس کا اقتداء اور اتباع کرنا چاہئے اور وہ مواسات بنفسہ ہے اور دوسرے مفسرین نے بھی یہ دونوں تفسیریں نقل فرمائی ہیں۔ مگر تفسیر ثانی میں آپ کی اس خصلت اور صفت کی تعیین نہیں فرمائی۔ علامہ زحمتی نے اس کو متعین فرمادیا کہ وہ مواساة بنفسہ ہے اور مراد اس سے جانی ہمدردی کرنا ہے۔ یعنی آپ خود بنفس نفیس جہاد فرماتے تھے پھر کسی کی کیا مجال اور ہمت جو اس میں آپ کا اقتداء نہ کرے۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ بھی اپنے جان پر کھیل گئے اور مالی قربانیوں کے ساتھ ساتھ جانی قربانیاں بھی جیسی کچھ پیش فرمائیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اس صفت میں تمام صحابہؓ سے بڑھے ہوئے حضرت صدیق اکبرؓ رضی اللہ عنہ تھے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خود ارشاد فرمایا کہ

ما احد عندی اعظم ید ا من ابی بکر آسانی بنفسه
 و مالہ - یعنی ابو بکرؓ سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں ہے اس لئے کہ انہوں
 نے اپنی جان و مال دونوں سے میری ہمدردی کی۔ سبحان اللہ اس سے کس قدر
 فضیلت حضرت صدیق کی مفہوم ہوئی۔

تو جب حضور اقدسؐ کی ذات شریف ہی قدوہ ہے پس ہر امر میں امت
 آپؐ کے اقتداء کی محتاج ہوگی۔ لہذا حقیقت عبودیت کا حصول اس وقت تک
 محال ہے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء نہ کی جائے گی!
 سہ پندار سعدی کہ راہ صفا تو اں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

خلاف پیمر کسے رہ گنبد کہ ہرگز نینزل نہ خواہد رسید
 اس لئے کہ صفت افتقار میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء
 ضروری و لازم ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کا افتقار الی اللہ اور
 احتیاج باللہ حاصل تھی جیسا کہ آپؐ کی دعاؤں سے ظاہر و باہر ہے۔

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے ہیں:-

اللهم انت نفسی تقواها و ذکرکھا انت خیر من ذکرکھا انت ولیہا
 و مولیٰہا و دوسری دعا یہ فرماتے ہیں اللهم ان قلوبنا و نواصینا و
 جوارحنا بیدک لم تملکنا منها شیئاً فاذا فعلت ذلک بنا فکن
 انت ولینا و اھدنا الی سواء السبیل۔

ان ادعیہ میں آپؐ خود فرماتیں کہ کس انداز سے جناب قدس میں حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم عرض و معروض فرماتے ہیں اور اپنی احتیاج و افتقار الی اللہ کا اظہار فرما
 تے ہیں کہ دوسرا کوئی اس طرح کر ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ آدمی اپنے نفس و
 اعضاء و ہاتھ پیر کو اپنی ملک سمجھتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق

بھی یہ فرما رہے ہیں کہ لہ تم ملکنا منہا شیئاً۔ یعنی آپ نے ان میں سے کسی کا ہم کو مالک نہیں بنایا اس کے بعد ان سب کی ولایت اور سوا سبیل کی ہدایت کی درخواست فرما رہے ہیں۔ یہ آپ کی انتہائی معرفت اور اعلیٰ درجہ کی انابت الی اللہ اور فناء ہے۔ صوفیہ کے کلام میں فنا کا ذکر آتا ہے اور اس وصف کو انہیں حضرات کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے مگر اس کوئی فنا نہیں سمجھنا حالانکہ فناء و بقا وغیرہ احوال جو صوفیہ کو ملے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے تو ملے ہیں اس میں بھی یہ لوگ مستقل نہیں ہیں۔

نیا در دم از خانہ چیزے نخست تو دادی ہمہ چیز ہا چر تست
یہ باتیں نعمت آنکھی تھیں مگر تھیں مفید اور کار آمد اس لئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اب اسل مضمون سنئے وہ یہ کہ خواجہ معصوم نے یہ فرمایا تھا کہ مقصود از سیر و سلوک شیخی و مرید گر فتن نیست مقصود از ادا اے و طائف بندگی است بے منازعت نفس۔ تو میرے خیال میں یہ سیکھتے ہی کی تعبیر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیر و سلوک سے مقصود اور اس کا منتہی تحصیل نسبت ہی ہے اور جب کسی میں یہ حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ شخص خود کو فنا ہی کر دیتا ہے اور اسی میں انسان کی خیریت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے جیسا کہ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

امید کہ آل برادر عزیز نیز عافیت امید کرتا ہوں کہ برادر عزیز بھی بخیریت ہو
باشند و بحقیقت صوری و معنوی متحقق اور ظاہری و باطنی جمعیت کے ساتھ
بودند و از لفظ بمعنی آیند و از ظل باصل متصف نیز الفاظ سے معنی میں از ظل سے
گر آیند و از ظل باصل شاہراہ است اصل کی طرف آگئے ہوں گے کیونکہ ظل
و مانع از وصول باصل تو یہ ظل است سے اصل کی جانب شاہراہ لگی ہے

باقی اصل تک پہنچنے میں مانع جو چیز ہے وہ
 ظل کا خود اپنی جانب توجہ کرنا اور اصل
 سے اعراض کرنا ہے اور اگر سیر و سلوک
 کے درپے بلکہ دیوں کہنا چاہئے کہ حق
 تعالیٰ کی عنایت ازلی کے سبب سالک
 کی توجہ ظل سے ہٹ کر اصل کی جانب
 ہو جائے اور بجائے اعراض کے اصل
 کی جانب اقبال ہو جائے تو سمجھنا چاہیے
 کہ سعادت کا رشتہ ہاتھ لگا اور سالک
 نے مضبوط کھڑے ہو جاتے ہیں پھر کیا سی
 جب تم نے معلوم کر لیا کہ کسی ظل ہو اور تمہارا
 اصل کون ہے؟ تو بس اب تم فارغ
 ہو گئے مر جاؤ چاہے زندہ رہو مقصود حاصل
 ہے۔

ظل جب اصل سے مل جاتا ہے اور اس کے
 ساتھ پیوست ہو جاتا ہے تو سالک اپنے اندر
 اضمحلال، استہلاک اور فنا اور نیستی کی
 کیفیت محسوس کرتا ہے اور یہ چیز اس
 کے حق میں کمال ہے اس لئے کہ سالک کا
 کمال ہی سلب کمال میں ہے اور اس کی
 خیریت ہی عدم خیریت میں ہے معرفت

نجد و اعراض اور اصل و چوں بسیر
 و سلوک بلکہ بعض عنایت ازلی توجہ
 نجد و ریزہ وال آرہ و بجائے اعراض
 اقبال باصل پیدا آید سر رشتہ
 سعادت بدست افتد و متمسک
 بعروہ و ثقی اگر دوسرے
 چوں بدست کیستی کہ ظل کیستی
 فارغی اگر مردی و ورز کیستی
 بعد از وصول ظل باصل و لحوق
 اس سالک را استہلاک اضمحلال
 است و فنا نیستی و این معنی کمال
 است در حق او کمال او در سلب
 کمال است و خیریت او در انتقال
 خیریت، معرفت و البتہ باین فنا
 است و قرب منوط باین انتفاء
 اذا تجلی اللہ بشئی خضع لہ

جس چیز کا نام ہے وہ اسی فناء سے فاسد
ہے اور قرب اسی انتقام سے ملا ہوا ہے
اللہ تعالیٰ کی تجلی جب کسی چیز پر ہوتی ہے
تو وہ اس کے سامنے پست اور خاضع
ہو جاتی ہے

اس فناء اور نیستی کے بعد نفس کے اندر
اس بات کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے
کہ اس کو اپنے پاس سے زندگی بخشیں
اور اپنے اخلاق کے ساتھ اس کو
مستقل بنا دیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا ہے
کہ جس کو میں قتل کر دوں تو میں ہی
اس کا خون بہا ہوں اور پھر اس کے
بعد اس شخص کو ناقصوں کی تکمیل کے
لئے مقرر فرما دیتے ہیں۔ دیکھو ارشاد
فرماتے ہیں کہ ایسا شخص جو پہلے مردہ
تھا ہم نے اس کو زندہ بنا دیا اور ہم
نے اس کو ایک ایسا نور دیا کہ وہ اس کو
لئے ہوئے آدمیوں میں جلتا پھرتا ہے
چنانچہ اس آیت میں اسی شخص کے
حال کی خبر ہے اب اس وقت جا کر اس کے
حق میں نعمت تمام ہوتی ہے اور خلافت

و بعد ازاں مستعد آں می شود
کہ اور از نزد خود حیات دہند
و باخلاق خود متخلق سازند من
قتلتہ فانا دیتہ و تکمیل
ناقصاں باز نشن گردانند آیت
کہ میا و من کان میتا فاحیینا
و جعلنا لہ نوراً الیمشی بہ
فی الناس نشان حال اوست
آں زباں نعمت و رحق او تمام شود
و معنی خلافت بطور آید
ایں کار دولت است کنون تا کر او ہند

مکتوبات معصومیہ ص ۸۳

معنی کا ظہور ہوتا ہے یہ دولت اور
سلطنت کا کام ہے اور ایک منصب
عظیم ہے دیکھا جائے کہ کب اور کسے
عنایت فرماتے ہیں۔

دیکھتے اس سے معلوم ہوا کہ خلافت باطنی کس قدر زبردست منصب ہے
اور اس کے کتنے شرائط ہیں اب منصب تو لینا چاہتے ہیں لیکن شرائط اور آداب
نہیں اختیار کرنا چاہتے اصحح طور پر یہ بھی نہیں ہوتے اور پیرین جانا چاہتے
ہیں۔

”برہیں تفادوت رہ از کجا است تابجا“

اسی طرح سے حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام پر نور باطن
کی تحصیل کے لئے اتباع سنت کو ضروری قرار دیتے ہیں اس مسئلہ پر کتنی زور دار
کلام فرماتے ہیں۔ کسی طالب کو لکھتے ہیں کہ:-

مخدوم من اودت و کثرت ایکد و سر	مخدوم واحدت و کثرت نہ
کی نہ ہے طلب وحدت کے لئے ترک	یکد گیر اند طالب وحدت را ترک
کثرت ناگزیر ہے جس قدر کثرت کے	کثرت ناگزیر است ہر قدر
علاقہ اپنے سے رکھے گا اسی قدر وحدت	جہات کثرت با خود دارد وہاں
حقیقی سے دور اور مجبور ہے گا۔	قد از وحدت حقیقی دور و مجبور
سالک کو وحدانی ہونا چاہئے طلب	است وحدانی باید بود ہم
اور محبت کے اعتبار سے بھی اور علم و	از روئے طلب و محبت و ہم
ارادت کے اعتبار سے بھی تاکہ نسبت	از روئے علم و ارادت تا مناسبت
پیدا ہو جائے اور آئینہ وحدت بن جائے	پیدا آید و مرآت وحدت

گردد و بتوحید حقیقی رسد۔
التوحید اسقاط الاضافہ
اور توحید حقیقی تک سا لک کی رسائی ہو جائے
کیونکہ توحید تعلقات کے ساقط کرنے کا
نام ہے۔

اوقات را نذر و فکر مہمور
دارند و در تنویر باطن کو شند کہ
محفل نظر مولیٰ است و تنویر
باطن منوط بدوام ذکر و مراقبہ
است و مربوط بادائے وظائف
بندگی دادائے فرائض و سنن
و واجبات و اجتناب از
بدعات و محرمات و مکروہات
بر قدر کہ در اتباع شرعیات
و سنت و اجتناب از بدعت
کو شیدہ آید نور باطن بفراید
و را ہے بجناب قدس بکشاید
اتباع سنت البتہ منجی است
و نتیجہ بخش و رفع درجات احتمال
تخلف ندارد۔

اپنے اوقات کو ذکر و فکر سے مہمور اور
آباد رکھو اور باطن کو روشن کرنے میں
کو شش کرو اس لئے کہ وہی نظر مولیٰ
کا محل ہے اور یہ سمجھ لو کہ تنویر باطن کا
تعلق ان امور کے ساتھ ہے دوام ذکر
مراقبہ و وظائف بندگی کی ادائیگی یعنی
ادائے فرض و سنن و واجبات، نیز
بدعات و دیگر محرمات و مکروہات
سے اجتناب
چنانچہ جو شخص جس قدر بھی اتباع
سنت اور عمل بالشریعہ اور اجتناب
بدعت میں زیادہ کوشش کرے گا
اتنا ہی زیادہ اسے نور باطن حاصل
ہوگا اور حق تعالیٰ کی راہ اس پر کھلے گی
بلاشبہ اتباع سنت بجات دینے والی
چیز ہے بہر صورت نفع بخش اور درجہ
کو بلند کرنے والی اس میں خلاف کا
تو احتمال ہی نہیں۔

و ما درائے آلِ خطر و خطر است
وراء شیطان فالحدّ کلّ الیہ
لیکن اس کے ماسوا جو چیزیں ہیں
ان میں خطرہ ہی خطرہ ہے بلکہ وہ شیطانی
راستہ ہے لہذا ان سے بہت اجتناب
کرنا اور احتیاط کلی رکھنا اس لئے کہ حق
کے بعد بجز گمراہی کے اور رہ ہی کیا جاتا ہے
دینِ متین کو جو کہ وحیِ قطعی سے ثابت
ہے محض لغوی باتوں اور ادھامِ خیالات
سے تو چھوڑا نہیں جاسکتا۔
وما علی الرسول
الا البلاغ

بر رسولال بلاغ باشد و لیس
حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کا کلام آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ سبحان اللہ
کیا کلام ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طریق کو کتنا سمجھ سہئے
ہیں چنانچہ کیسا ہی کوئی شخص کم ہمت ہو حضرت کے بیان کے بعد ایک مرتبہ
تو کمزور ہمت کس کو راہِ خدا میں کھڑا ہی ہو جائے گا۔ تاہم طریق کی غرض و غایت
کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کلام جو کہ
القول الجمیل سے نقل کیا گیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے جس کا حاصل یہی تھا
کہ سائے طرق کا مرجع ہیئتِ نفسانیہ (یعنی نسبت کی تحصیل ہے اس لئے کہ
اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کو ارتباط و انتساب حاصل ہوتا ہے
چنانچہ حضراتِ صوفیاء نے جو اشغال و مراقبات تعلیم کئے ان سے مقصود
نفس میں اسی ملکہ کو پیدا کرنا اور راسخ کرنا تھا اگرچہ نسبت کی تحصیل کچھ ان
اشغال پر بھی موقوف نہیں کیونکہ حضراتِ صحابہ کرامؓ نہ تو بعینِ اس نسبت و سکینہ
کو دوسرے طرق سے حاصل کیا کرتے تھے، مثلاً صلوٰۃ و تسبیحات پر حضور

قلب کے ساتھ مواظبت، نیز طہارت پر مداومت، موت کی یاد، جنت، دوزخ کا پیش نظر رکھنا اسی طرح تلاوتِ قرآن پر مواظبت اور اس کے معانی میں تدبر وغیرہ کرنا۔

غرض ان سب امور پر یہ سب حضرات ایک مدت تک مواظبت فرماتے تھے جس کی وجہ سے قلب میں ایک ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور تادمِ آخر اس کی محافظت فرماتے تھے اور یہی وہ نسبتِ مسلسلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہِ مشائخ متوارث چلی آرہی ہے جس میں کوئی شک نہیں اسی کو شاہ صاحب نے طریقِ کا مرجع اور اس کا حاصل کہا ہے اور ایک اور مقام پر اس کو غنیمتِ کبریٰ فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ نسبتہائے صوفیہ غنیمتِ است کبریٰ و رسومِ ایشان بہیچ معنی ارزد۔

آخر میں صوفیہ کے اشغال و مراقبات کے متعلق بھی ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ان حضرات نے نسبت ہی کی تفصیل اور اس کی تکمیل کے لئے بطورِ معاونت کے اشغال وغیرہ تجویز فرمائے اگرچہ حضراتِ صحابہ اسی نسبت کو صرف اعمالِ شرعیہ کا سے حاصل کر لیتے تھے تو حجبِ اعمالِ شرعیہ کو تحصیلِ نسبت کے لئے بعد کے لوگوں نے کافی نہ بنایا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اشغال کی بھی ضرورت سمجھی گئی۔ کیونکہ دیکھا گیا کہ لوگوں میں نماز، روزہ، موجود ہے مگر نسبت غائب تو اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مشائخ نے جن چیزوں کا اضافہ فرمایا تھا اب ہو سکتا ہے کہ ان کی بھی صرف صورت ہی صورت رہ گئی ہو اور اثر اور مقصود ان سے ختم ہو چکا ہو چنانچہ اس زمانہ میں لوگوں کا حال یہی دیکھ رہا ہوں کہ طریق کی چیزوں کے صرف ظاہر کو لے رکھا ہے اور اس کے باطن سے نظر پھیرے ہوئے ہیں جس طرح سے غامِ لوگوں کا حال ہے کہ نماز روزہ پر توجہ عمل ہے

مگر اس سے جو مقصود تھا تحصیل نسبت اور اس پر مواظبت اور اس کی محافظت ان سب باتوں کی جانب ذرا بھی توجہ نہیں اور وجہ کلی اس کی یہ ہے کہ مقصود اور غیر مقصود میں امتیاز باقی نہیں رہا۔ مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی کی جزئی یہ بھی ہے کہ مشایخ کو مقصود سمجھا جاتا ہے ادا ان کے پاس جو دولت ہے یعنی نسبت مسلسلہ اور تدر اور سکینہ اس کی تحصیل کی فکر نہیں۔ اس زمانہ میں طریق کے اندر یہ ایک بہت بڑی بدعت داخل ہو گئی ہے جس نے طریق کو فاسد کر دیا اور وہ یہی کہ نہ مقصود کی خبر ہے اور نہ غیر مقصود کا علم اسی چیز کو آپ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ اگر اس ایک بات کو سمجھ لیجئے گا تو بہت بڑے منحصہ سے نکل جائیے گا اور دینِ خالص سے قدرِ مقدر نصیب پا ہی جائیے گا ورنہ ساری عمر بھی کہیں آئیے جائیے گا اور کچھ بھی کشود کار نہ ہوگا۔

احوالِ رفیعہ

یہاں تک تو کلام نسبت کی تشریح و تفصیل اور اس کے ذریعہ تحصیل سے متعلق تھا اب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے دوسرے جزو کی بھی کچھ توضیح کرنا چاہتا ہوں یعنی یہ کہ مداوم علی السکینہ کو جو احوالِ رفیعہ ملا کرتے ہیں وہ کیا ہیں اور اس مضمون کو میں ایک عجیب و غریب مضمون سمجھتا ہوں یوں تو یہ مضمون قرآن و حدیث میں آیا ہے اور علمائے بھی اس کو بیان فرمایا ہے اس لئے ایسا کچھ عجیب بھی نہیں ہے لیکن ہماری معلومات چونکہ محدود ہیں اور نظر سطحی ہے اس لئے ان کو عجیب و غریب ہی کہا جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمانے کے بعد کہ رسکینہ پر مداومت

کرنے والے کس لئے کچھ حالات رفیع ہوتے ہیں جو اسے نوبت نبوت ملتے ہیں پس سالک کو چاہئے کہ ان حالات کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعت کے عند اللہ مقبول ہونے اور باطن نفس اور سوزیدائے قلب میں اثر کرنے کے علامات ہیں (۱) آگے بعض احوال رفیعہ کو شمار کرایا ہے جو کہ مداوم علی السکینہ کو حق تعالیٰ کی جانب سے مرحمت فرمائے جاتے ہیں۔

(۱) مثلاً ایک حال اس کو یہ ملتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کو تمام ماسواہ پر ترجیح دیتا ہے۔

(۲) اسی طرح سے ایک حال اس کو یہ ملتا ہے کہ اس پر خوف و خشیت کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ قلب سے نکل کر بدن اور جوارح پر بھی اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے

(۳) اسی طرح سے ایک انعام مواظب علی السکینہ کو اس دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اسے عمدہ عمدہ خواب نظر آتے ہیں جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ رجل صالح کارؤیاء صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت سے صرف مبشرات رہ جائیں صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب جسے کوئی رجل صالح دیکھے یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کے قول لَہُم مِّنَ الْبَشَرِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا میں بشری کی تفسیر رؤیاء صالحہ ہی سے کی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح سے ایک حال صاحب سکینہ کو اس دار دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اس کو فراست صحیحہ حاصل ہوتی ہے یعنی ایسا خاطر جو واقع کے مطابق ہو۔ اسی حدیث شریف میں آتا ہے کہ اتقوا فراست المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ یعنی مؤمن کی فراست سے دُور اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

صاحب شفاء العلیل نے فراست صادقہ کے معنی لکھے ہیں کہ ٹھیک
 اٹکل۔ یعنی مداوم علی السکینہ کو ایک انعام یہ ملتا ہے کہ جس چیز کے متعلق غور
 کرنا چاہتا ہے تو اس کے قلب میں واقعہ کے مطابق اتفاق کر دیا جاتا ہے چنانچہ
 اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ہیں جو اسلاف کے حالات میں پاتے جاتے
 ہیں یہاں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

۱۔ رسالہ قشیریہ میں حضرت ابراہیم خواص کا یہ واقعہ منقول ہے۔ فرماتے ہیں
 کہ میں بغداد کی جامع مسجد میں تھا وہاں فقراء کی ایک جماعت موجود تھی اتنے میں
 ایک جوان نہایت ہی ہنس مکھ باوقار خوبصورت، اور نہایت ہی عمدہ خوشبو
 لگائے ہوئے سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اپنے اصحاب سے کہا کہ میرے قلب
 میں یہ آ رہا ہے کہ یہ شخص یہودی ہے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ فکلمہ کر ہوا
 ذلک یعنی میری بات کو تقریباً سب ہی نے ناپسند کیا تاہم میں تو یہ کہہ کر مجلس سے
 اٹھ گیا اور وہ جوان آیا اور حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ میرے متعلق شیخ نے
 کیا فرمایا اس پر بھی لوگوں کو سمیت شیخ کے مقولہ کو اس سے نقل کرنے کی نہیں ہوئی
 بلکہ اس کی ظاہری وجاہت سے مرعوب ہو گئے۔ اس نے اصرار کیا کہ بتائیے شیخ نے
 کیا فرمایا ہے اس پر لوگوں کو کہنا پڑا کہ شیخ نے یہ فرمایا ہے کہ تم یہودی ہو۔ حضرت
 ابراہیم فرماتے ہیں کہ یہ سننے ہی وہ جوان میرے پاس آیا اور میرے ہاتھوں پر سر رکھ
 دیا اور مسلمان ہو گیا کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے اسلام کا سبب کیا ہوا؟
 اس نے کہا کہ ہم اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے تھے کہ صدیق کی فراست خطا نہیں
 کرتی یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ مسلمانوں کا امتحان کروں گا پھر میں نے غور و تامل
 کیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ اہل اسلام بھی صدیق اگر ہو سکتے ہیں تو اسی طائفہ صوفیہ ہی
 میں ہو سکتے ہیں اس لئے کہ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی باتیں بیان کرتے ہیں چنانچہ میں نے

تہا کے اوپر القباس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی باوجود اس کے جب تمہارے شیخ اپنے نور فراست سے مجھ کو تاثر لیا اور پہچان لیا کہ میرے اس ظاہر میں باطن کچھ اور ہے تو مجھے اب یقین ہو گیا کہ بس یہی صدیق ہیں۔ چنانچہ وہ جوان اُن کی خدمت میں رہا اور کبار صوفیہ میں سے ہوا۔

۲۔ اسی کے مثل ایک اور واقعہ سنئے مالاہد میں کتاب الاحسان میں ہے کہ نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو درویش از سینہ درویشاں باید جست و دباں کے سینے سے تلاش کرنا چاہئے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن کرنا چاہئے خیر و شر بفرست صحیحہ دریافت شود تاکہ فراست صحیحہ حاصل ہو اور اس کے ذریعہ ہر خیر و شر کو معلوم کیا جاسکے۔ (مالاہد منہ ص ۱۷۳)

اس فراست صحیحہ پر جاشینہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور اس پر یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ :-

ایک شخص درویشوں کا جبہ اور دلق پہنے ہوئے حضرت خواجہ عبدالحق عجدوانیؒ کی مجلس میں آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا جب حضرت لوگوں کو پند و نصیحت کرنے سے فارغ ہو چکے تو اس شخص نے اٹھ کر حضرت سے یہ سوال کیا کہ اتقوا فراست المؤمن کا کیا مطلب ہے اور وہ فراست کیا چیز ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ فراست یہ ہے کہ تم اپنا زُتار توڑ ڈالو، یہ سن کر اس نے شور مچایا اور کہا کہ معاذ اللہ مجھے زُتار سے کیا مطلب؟ اسی اثناء میں ایک مرید نے شیخ کا اشارہ پا کر اس کے دلق ربائی کو اس کے بدن سے الگ کر دیا تو اس کے نیچے سے زُتار نکلا یہ واقعہ دیکھ کر وہ شخص مسلمان ہو گیا۔ اصل واقعہ

تو ختم ہوا اس کے بعد شیخ نے اپنے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ دوستو! آؤ جس طرح اس نے اپنے ظاہری زندار کو توڑا ہے اور مسلمان ہو گیا ہے یا رد! آؤ ہم سب بھی اپنے اپنے باطنی زندار کو توڑ ڈالیں اور اس وقت سے حق تعالیٰ کے ساتھ نیا عہد باندھیں شیخ کے اس کہنے پر لوگوں کے درمیان سے ایک شور اٹھا اور سب نے اسی وقت بیعت کی تجدید کی (حاشیہ مالا بدمنہ)

سبحان اللہ! عجیب واقعہ ہے ظاہر ہے کہ پھر اس کے بعد ان لوگوں نے کیسا کچھ عہد باندھا ہوگا۔

اجابتِ دعا

۶۱، اسی طرح سے منجملہ ان احوال رفیعہ کے جو حق تعالیٰ کی جانب سے مدام علی الکینہ کو مرحمت فرمائے جاتے ہیں ایک عظیم الشان حال اجابتِ دعا بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی نسبت اور ایسا تعلق بندہ کا قائم ہو جائے کہ اب اس کے بعد اپنی جس ضرورت کو یہ طالب اپنی جہد ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیں۔ جس طرح کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی تھے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ مستجاب الدعوات ہیں۔ ایک مرتبہ کسی جنگ میں یہ بھی شریک تھے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعا کی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور سب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ تھی اجابتِ دعا جو مومن کو ملا کرتی ہے۔

۷۔ اسی طرح سے اس کو یہ مرتبہ بھی عطا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ توکل

کر کے کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں تاکہ اس کا صدق ظاہر ہو جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رَبِّ اَعْبَرَا شَعْتَ ذِي طَيْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَا بَرَاءَ۔ یعنی بہت سے شخص غبار آلود، پر آئندہ بال۔ پچھٹے پرانے کپڑے والے جن کو کوئی خاطر میں نہ لاتا ہو (یعنی لوگوں کی نظروں میں بے وقعت ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتا ہے کہ) اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرما دیں۔ مطلب یہ کہ ظاہر حال تو اس کا ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھنا تک گوارا نہ کریں مگر خدا کے نزدیک اس کا ایسا درجہ کہ وہ جو کچھ زبان سے نکال دے تو اس کے تعلق اور مقبولیت کی لاج رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ فرما دیں سبحان اللہ کیا مرتبہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس دار دنیا میں اپنے بندوں کو کیا کیا دیتے ہیں۔

اس تو کل اور لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَا بَرَاءَ کی ایک مثال حدیث شریف کے ایک واقعہ سے دیتا ہوں۔

ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میری جھوٹھی رُبیع نے ایک باندی کے سامنے کے دانت توڑ دیئے لوگوں نے کوشش کی کہ وہ معاف کر دے مگر اس کے قبیلہ والوں نے صاف انکار کر دیا پھر لوگوں نے چاہا کہ ارشش یعنی اس کی قیمت ہی لے لے اور قصاص سے باز آجائے مگر خاندان والوں نے یہ بھی نہ مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدمت میں مقدمہ پیش کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم شرعی یعنی قصاص کا فیصلہ فرما دیا۔ یعنی یہ کہ اس کے بدلے میں ان کے بھی دانت توڑے جائیں۔ آریہ فیصلہ سن کر حضرت انس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول

کیا میری بھو بھی کے دانت ٹوٹ جائیں گے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے اس کے دانت تو نہیں ٹوٹیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے انس کیسی باتیں کرتے ہو کتاب اللہ میں قصاص کی تصریح موجود ہے (مراد اس سے آپ کی یہ آیت تھی وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْتَ النَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنُ بِالْعَيْنِ وَالْأُذُنُ بِالْأُذُنِ وَالْأَنْفُ بِالْأَنْفِ وَاللِّسَانُ بِاللِّسَانِ وَالْجُرُوحُ قِصَاصٌ) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر اس جاریہ کی قوم راضی ہو گئی اور انہوں نے قصاص معاف کر دیا اور میری بھو بھی کے دانت صحیح و سالم رہ گئے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللَّهِ مَنْ تَوَاقَسَمَ عَلَى اللَّهِ لَا يَرَىٰ عَنِ اللَّهِ تَعَالَىٰ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے جھوٹے قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کے مطابق معاملہ فرماویں۔

میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد حضرت انسؓ کا یہ کہنا کہ دانت تو نہیں ٹوٹیں گے اللہ و رسولؐ کے حکم کا مدعا اللہ ذکر کرنا نہیں تھا بلکہ محض توکل علی اللہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید اللہ تعالیٰ خصم کو راضی فرما دیں اور وہ قصاص کو معاف کر دے ایک آئندہ ہونے والی بات کی خبر دینا تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ان احوال اور صاحب کینہ کو مرحمت فرمائے جانے والے انعامات کا ذکر کر کے حضرت شاہ صاحبؒ آخر میں پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وبالجملة فہذا الوقائع و امثالہا دالة علی صحة ایما الرجل وقبول طاعاته وسواية النور فی صمیم قلبہ فلیغتمہا۔ یعنی خلاصہ کلام یہ کہ ایسے حالات رفیعہ جو مذکور ہوئے اور انہیں کے مانند اور

دیگر حالات عالیہ یہ سب دلالت کرتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے اور اس کی طاعات عند اللہ مقبول ہیں اور نور ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ لہذا سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت جانے، کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل اور دنیا میں یہی اس کے لئے تسلی کا باعث بن سکتے ہیں۔ ایمان کی صحت اور طاعات کا قبول ہونا یہ کیا کچھ کم مرتبہ رکھتا ہے یہ سب علامات مذکورہ اسی کی فرع ہیں۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کیسی عمدہ بات بیان فرمائی کہ اجابت دعا بھی انہیں احوال رفیعہ میں سے ہے جو صحت ایمان اور قبول طاعات پر ملتے ہیں اور ان کی اصل یعنی سکینہ کی تحصیل اور اس کی مداومت پر یہ عطا ہوتے ہیں جیسا کہ آپؐ صحابہ کے واقعات میں ملاحظہ فرمایا چنانچہ یہ اور اس قسم کے بیشمار واقعات اسلاف کے ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے صالحین بندوں کو ان کے دوام علی السکینہ کے صلہ میں اجابت دعا کا مقام عطا فرماتے ہیں کس قدر قدر دانی ہے ایمان مومن کی سبحان اللہ!

اسی مضمون کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ مثنوی میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ تو چنین خواہی خدا خواہد چنین می دہد یزداں مراد متقیین یعنی تم یوں چاہتے ہو تو خدا بھی یوں ہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کی مراد پوری فرماتے ہیں۔

آخر میں ایک بات یہ کہتا ہوں کہ یہ وہ احوال تھے جن پر اہل اللہ نے دنیا کو تھج دیا تھا۔ چنانچہ ان کے حصول کے بعد دنیا کی کچھ بھی وقعت اور قدر ان کے قلوب میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت مولانا قدس سرہؒ کبھی کبھی مجلس میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور کچھ اس ذوق سے پڑھتے تھے کہ سامعین پر عجیب کیف

طاری ہو جاتا تھا وہ شعر یہ ہے

بفراغ دل زمانے نظر سے بہ ماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

اس وقت آپ کے سامنے اجابت دعا کے سلسلہ میں چند واقعات اور بیان کرنا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ بڑے ہی عجز کے واقعات ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی دعا ضرور قبول فرماتے ہیں رسالہ قشیرہ میں ہے کہ خلیفہ مرعشی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم رحم کی خدمت میں بہت دنوں تک رہا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ ان کا سب عجیب تر واقعہ جس کا تم نے مشاہدہ کیا ہو بیان کرو۔

خلیفہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ مکہ شریف کے سفر میں تھے کئی دنوں سے کھانے کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی تھی کہ اسی اثنا میں ہم کو فہ پہنچے اور وہاں ایک ویران و شکستہ مسجد میں قیام کیا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم نے میری جانب دیکھا اور فرمایا کہ خلیفہ تم پر تو بھوک کا اثر دیکھ رہا ہوں! میں نے عرض کیا کہ حضرت نے بجا ارشاد فرمایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا ذرا قلم دوات اور کاغذ تولے آؤ۔ میں نے لاکر پیش کیا تو اس پر تحریر فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انت المقصود ابیہ بكل حال والمشار الیہ بكل معنی۔ یعنی ہر حال میں آپ ہی مقصود ہیں اور ہر معنی سے آپ ہی مراد ہیں اور اس کے بعد یہ اشعار لکھے۔

انا حامد انا شاکر انا ذا کر انا جالئ انا نائج انا عاری
میں آپ کی حمد کرنے والا ہوں اور آپ کا شکر کرنے والا ہوں اور آپ کی یاد کرنے والا ہوں۔ میں بھوکا ہوں میں پیاسا ہوں اور میرے بدن پر کپڑا نہیں ہے۔

ہی ستہ وانا الضحین لتصفھا فکن الضحین لتصفھا یا باری

یہ کل چھ چیزیں ہیں یعنی حمد و شکر، ذکر، بھوک، پیاس، عریانی، تو میں ان میں اول تین کا ضامن ہوتا ہوں، پس اے باری بقیہ نصف کے آپ ضامن ہو جائیے۔

مدحی لغیرک لہب نارخصتها فاجوعبدک من دخول النار
اور آپ یہ درخواست اس لئے کرتا ہوں کہ میرا آپ کے علاوہ کسی اور کی تعریف کرنا گویا
آگ کی لپٹ میں داخل ہونا ہے لہذا اپنے اس مسکین بندے کو دخولِ نار سے بچا
لیجئے۔

والنار عندی کا سوال فصل تری ان لا تکلفنی دخول النار
اور یہ میں نے دخولِ نار اس لئے کہا کہ کسی سے سوال کرنا میرے نزدیک بمنزلہ دخولِ
نار ہی کے ہے تو کیا آپ اپنے کرم سے مجھے دخولِ نار سے بچالیں گے؟
یہ لکھ کر مجھے رقعہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ اور خبردار اپنے قلب کو غیر اللہ سے متعلق نہ
کرنا اور سب سے پہلے جس شخص سے تمہاری ملاقات ہو اسے یہ رقعہ دیدینا۔ خلیفہ
کہتے ہیں کہ میں رقعہ لے کر چلا تو میری ملاقات سب سے پہلے ایک خچر سوار سے ہوئی میں نے
اسی کو وہ پرچہ دیدیا اس نے لیا پڑھا اور رونے لگا اور مجھ سے پوچھا کہ جن بزرگ نے
یہ پرچہ لکھا ہے وہ کہاں ہیں میں نے کہا کہ وہ تو فلاں مسجد میں مقیم ہیں یہ سن کر اس نے
مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ تھوڑے تھوڑے اور بڑے کرچلے دیا۔ پھر میری ملاقات ایک
اور شخص سے ہوئی میں نے اس سے دریافت کیا کہ خچر پر یہ جو شخص جا رہا ہے آپ
بتا سکتے ہیں یہ کون ہے اس نے کہا کہ ہاں یہ تو ایک نصرانی ہے اس کے بعد میں حضرت
ابراہیم بن ادہم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا قصہ سنایا انہوں نے فرمایا کہ اچھا
اس تھیلی کو اسی طرح سے رہنے دو ابھی وہ خود آتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی
کہ وہ نصرانی آیا اور منہ کے بل حضرت ابراہیم بن ادہم کے سامنے گرا اور مشرف
باسلام ہو گیا۔ سبحان اللہ! ایمان تازہ کرنے والا واقعہ ہے کبھی آپ کا البسا

بھی زمانہ تھا۔

دوسرا واقعہ سنتے۔

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ میں ایک لبتی میں پہنچا وہاں میں نے ایک نصرانی کو دیکھا جس کی کمر میں زنا ربندھی ہوئی تھی اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کو بھی ہمراہ لے لوں۔ چنانچہ ساتھ ہولیا اس کے بعد ہم دونوں سات دن تک سفر کرتے رہے پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اے اسلام کے درویش ہمیں بھوک لگی ہے۔ کچھ اپنی کرامت ظاہر فرمائیے۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے اس کافر کے سامنے رسوا نہ کیجئے (اپنے فضل و کرم سے کھانا عطا فرمائیے) یہ دعا کرتا تھا کہ ایک طباق نازل ہوا جس میں روٹی، بھنا ہوا گوشت کچھ کھجوریں، اور پانی کا کوڑہ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھایا پیا۔ اور پھر ہفتہ بھر چلتے رہے اس کے بعد اب کی دفعہ میں نے سبقت کی اور اس سے کہا کہ اے نصاریٰ کے راہب، اب تیری باری ہے تو بھی اپنی بزرگی دکھلا، یہ سن کر اس نے اپنی لاٹھی پر سر ٹیک لیا اور اللہ تعالیٰ سے کچھ دعا کی۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دو طباق رکھے ہوئے ہیں اور ان پر میرے طباق سے کہیں زیادہ کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ مجھے یہ منظر دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی (یہ خیال کر کے کہ یہ کافر سمجھے گا کہ نصرانیت اسلام سے بڑھ گئی) چنانچہ اسی سنج و غم میں میں نے کھانے سے انکار کر دیا اس نے بہت اصرار کیا مگر میں نے وہ کھانا نہیں کھایا۔ بالآخر اس نے کہا کہ میں آپ کے نہ کھانے کی وجہ سمجھ گیا ہوں، اچھا کھائیے اور آپ کو میں دو خوشخبریاں سناتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کے سامنے کلمہ اسلام پڑھتا ہوں اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ

داشہد ان محمد ارسول اللہ - یہ پڑھ کر زنا توڑ کر پھینک دی -
 اور دوسری خوشخبری یہ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ، یا اللہ
 اگر آپ کے اس بندے کا (یعنی آپ کا) تیرے نزدیک کوئی مرتبہ ہو تو اس کی
 برکت سے میرے اوپر فتح فرما دیجئے (چنانچہ یہ سب جو آپ دیکھ رہے ہیں آپ
 ہی کی برکت ہے)

ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ یہ سن کر ہم نے کھانا کھایا اور پھر ہم دونوں نے
 اپنا راستہ لیا۔

چنانچہ حج بیت اللہ کیا اور مکہ معظمہ میں ایک سال تک ہم دونوں مقیم
 رہے۔ پھر اس شخص کا وہیں انتقال ہو گیا اور لطائف میں دفن ہوا۔
 اسی سالہ قشیر باب الدعاء میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی
 روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص
 تھا جو بغرض تجارت بلاد شام سے مدینہ اور مدینہ سے شام کا سفر کیا کرتا تھا
 اور اپنے سفر میں قافلوں کے ساتھ نہیں جاتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے
 تنہا سفر کیا کرتا تھا ایک مرتبہ شام سے مدینہ آ رہا تھا کہ راستہ میں اس کو ایک چور ملا
 جو گھوڑے پر سوار تھا اس نے تاجر کو آواز دی کہ ٹھہر جاؤ تاجر ٹھہر گیا اور چور
 سے کہا کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے جانے دو چور نے جواب دیا کہ یہ مال تو میرا ہے ہی
 میں تمہاری جان لینے کا ارادہ رکھتا ہوں تاجر نے اس سے کہا کہ میری جان لے
 لینے سے تم کو کیا نفع کی امید ہے میرا مال لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ چور نے پھر وہی
 پہلی بات کہی تو تاجر نے اس سے یہ کہا کہ اچھا مجھ کو اتنی مہلت دے دو کہ میں وضو
 کر کے نماز پڑھ لوں اور اپنے رب عزوجل سے دعا کروں چور نے جواب دیا کہ
 ہاں تم جو چاہو کرو۔ تاجر وضو کر کے کھڑا ہوا اور چار رکعت نماز پڑھی پھر اپنا

ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی :-

يَا دُودُو يَا دُودُو يَا ذَا الْعَرْشِ الْمَجِيدِ يَا مُبْدِي يَا مُعِيدُ
يَا فَعَالُ لِمَا يَرِيدُ اسْأَلُكَ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي
مَلَأَ أَرْكَانَ عَرْشِكَ وَأَسْأَلُكَ بِقُدْرَتِكَ الَّتِي
قَدَرْتَ بِهَا عَلَى جَمِيعِ خَلْقِكَ وَبِرَحْمَتِكَ الَّتِي
وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ لَا إِلَهَ أَنْتَ يَا مُغِيثُ اغْنِنِي

یہ دعا اس نے تین مرتبہ پڑھی جب دعا سے فارغ ہوا تو اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ جو چمکتے ہوئے گھوڑے پر سوار تھا اور سبز کپڑے پہنے ہوئے تھا اس کے ہاتھ میں نور کا ایک حربہ تھا جب چور نے اس سوار کو دیکھا تو تاجر کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا جب اس کے قریب پہنچا تو اس سوار نے چور پر حملہ کیا اور نیزے سے مار کر اس کو اس کے گھوڑے سے گرادیا۔ پھر تاجر کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اٹھو اور چل کر اس چور کو تم ہی قتل کرو۔ تاجر نے اس سے کہا کہ تم کون ہو؟ میں نے تو کبھی کسی کو بھی قتل نہیں کیا اور نہ میرا جی اس کو قتل کر کے خوش ہو گا پس وہ سوار واپس لوٹ کر چور کے پاس آیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر تاجر کے پاس واپس آیا اور اس سے کہا کہ سنو میں تیسرے آسمان کا ایک فرشتہ ہوں جب تم نے پہلی مرتبہ دعا کی تو ہم لوگوں نے آسمان کے دروازوں سے حرکت کی آواز سنی اور آپس میں ہم لوگوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی امر حادث ہوا ہے پھر جب تم نے دوبارہ دعا کی تو آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور اس سے آگ کی چنگاریوں کی طرح شرارے نکلنے لگے پھر جب تم نے تیسری مرتبہ دعا کی تو حضرت جبریل علیہ السلام اوپر سے ہمارے پاس تشریف لائے اور یہ ندا کر رہے تھے کہ :-
من لهذا المكروب - کون اس مصیبت زدہ کے کام آدے گا تو میں نے

اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ مجھ کو اس چور کے قتل کا متولی بنائیجئے۔ اور یہ کہا کہ اے عبد اللہ تم یہ جان لو کہ جو شخص تمہاری اس دعا کو کہرت اور مصیبت اور شدت کے وقت میں پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت اور پریشانی کو دور فرمادیں گے اس کے بعد وہ تاجر اپنا مال لے کر سلامتی کے ساتھ مدینہ شریف پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کی نیز اس دعا کی اطلاع دی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ لَقَدْ لَقَنَّكَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ عَنْ أَسْمَاءَ الْحَسَنِیِّ النَّحْثِ إِذَا دَعَىٰ بِهَا أَجَابَ وَإِذَا سَأَلَ بِهَا أُعْطِيَ۔

یعنی البتہ تحقیق اللہ عزوجل نے تم کو اپنے ان اسماء حسنہ کی تلقین فرمائی ہے کہ جب ان کے واسطے سے کوئی دعا کی جائیگی تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے اور جب ان کے وسیلے سے سوال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔

نیز صاحب رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ میں نے استاد ابو علی سے سنا وہ فرماتے تھے کہ یعقوب بن لیث کو کوئی بیماری ایسی لاتی ہوئی کہ تمام اطباء اس کے علاج سے عاجز ہو گئے تو لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ کی ولایت میں ایک صالح شخص ہیں جن کا نام سہیل بن عبد اللہ ہے اگر وہ آپ کے لئے دعا فرماویں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے ان کو بلا بھیجا اور درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا فرمائیجئے تو حضرت سہیل نے فرمایا کہ تمہارے حق میں میری دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جبکہ تمہارے قید خانہ میں بہت سے مظلومین موجود ہیں بادشاہ نے اسی وقت جتنے لوگ اس کے قید خانہ میں تھے سب کو رہا کر دیا۔ تب حضرت سہیل نے اس کے لئے ان الفاظ میں دعا فرمائی۔

اللهم كما اريتہ ذل المعصية فادع عذ الطاعة و
فرج عنه۔ یعنی یا اللہ جیسا کہ آپ نے اس کو معصیت کی ذلت دکھائی ایسے ہی

طااعت کی عزت دکھا دیجئے اور اس کی تکلیف دور فرما دیجئے۔

پس وہ فوراً اچھا ہو گیا اور حضرت سہیلؒ کی خدمت میں کچھ مال پیش کیا انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار فرمایا تو لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اگر اس کو قبول فرما لیتے اور فقراء کو دیدیتے تو کیا حرج تھا پس انہوں نے صحرا کی کنکریوں کی طرف ایک نظر فرمائی اور وہ اسی وقت جواہر ہو گئیں۔ تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایسی دولت عطا فرمائی ہو کیا وہ یعقوب ابن لیث کے مال کا محتاج ہو سکتا ہے؟

اسی طرح حضرت لیث سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں نے ابن نافع کو نابینا دیکھا پھر کچھ دنوں کے ان کو دیکھا کہ آنکھ دالے ہو گئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کی بینائی کس طرح آپ کو واپس ملی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہا گیا کہ یہ دعا پڑھو۔

یا قریب یا مجیب یا سمیع الہاء یا لطیف المايشاء
رد علیٰ بصری۔ چنانچہ میں نے یہ دعا پڑھی تو اللہ عزوجل نے میری بینائی لوٹا دی۔

سبحان اللہ یہ ہے اجابت دعا جو اللہ تعالیٰ اپنے ملازم علی السکینہ بندوں کو مرحمت فرماتے ہیں۔

فرعون کی دعا کا قبول ہونا

اجابت دعا کے سلسلے کے یہ وہ واقعات ہیں جو مومنین صالحین سے متعلق تھے اب آپ کے سامنے فرعون کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جسے صاحب روح المعانی نے (ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات) کے تحت لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ہی عبرت اور نصیحت کا واقعہ ہے۔ وہی ہذا۔

اخرج الحکیم الترمذی حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابن
فی نوادر الاصول وابن ابی حاتم عن ابن عباس
قال لما اخذ الله تعالى آل فرعون بالسنين
يليس كل شيء لهم وذبت مواشيهم حتى يليس
مصر فاجتمعوا الى فرعون وقالوا له ان كنت
تزعم فأتنا في نيل مصر بماء فقال غدوة يصبكم
الماء فلما خرجوا من عند

ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کو قحط میں مبتلا کیا تو ان کے یہاں کی ہر چیز خشک ہو گئی تمام جانور اور مویشی مر گئے یہاں تک کہ مصر کا مشہور دریا نیل بھی خشک ہو گیا یہ دیکھ کر قوم کے سب لوگ فرعون کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرا گمان ہے (یعنی معاذ اللہ خدا ہے) تو ہمارے دریاے نیل میں پانی لے آ۔ اس نے کہا اچھی بات ہے کل صبح اس میں

قال ای شیء صنعت
 انا لا اقدر علی ذلك
 فعداً ایکن بوننی فلما
 كان جوف اللیل
 قام واغتسل ولبس
 مدرعة صوف ثم
 خرج حاذیاً حتی اتی
 النیل فقام فی بطنه
 فقال اللهم انك تعلم
 انی اعلم انك تقد
 علی ان تملأ نیل مص
 ماء فاملا ماء فلما
 علم الا نجیر الماء یقبل
 فخرج واقل النیل مطرعا
 بالماء لما اراد الله تعالی
 بهم من الهلكة -
 روح المعانی ص ۲۸ پ

پانی آجانے کا جب لوگ اس کے پاس
 سے چلے گئے (اور فرعون تنہا ہوا تو اس
 نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں کیا کروں گا۔
 میں تو پانی لانے پر قادر نہیں بنتیجہ یہی ہوگا
 کہ یہ لوگ کل صبح میری تکتیب کریں گے
 (اور میں رسوا ہو جاؤں گا، چنانچہ جب
 ادھی رات ہوئی تو فرعون اٹھا اور غسل
 کیا اور صوف کا جبہ پہنا اور ننگے پاؤں
 نیل کے پاس آیا اور دریائے نیل میں
 کھڑے ہو کر یہ دعا کی کہ اے اللہ تو جانتا
 ہے کہ میں تجھ کو اس بات پر قادر سمجھتا
 ہوں کہ دریائے نیل کو تو پانی سے بھر
 سکتا ہے لہذا تو اسے پانی سے بھر دے
 اس کا اتنا کہنا تھا کہ اسے پانی کے آنے کا
 شور محسوس ہوا فوراً دریائے نیل پر نکل
 آیا اور دریائے نیل پانی سے لبریز ہو کر
 رواں ہو گیا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں
 فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت اسی
 نیل میں غرق ہو کر مقدر تھی۔

سبحان اللہ یہ روایت عجیب روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ
 کافر کا بھی دعا قبول فرمالتے ہیں۔ دیکھئے فرعون کی دعا کو بھی شرف قبول بخشا۔

حالانکہ وہ خدائی کام دعی تھا لیکن حیب تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے غمز کا اقرار کیا اور معاملہ کو اسی کے حوالہ کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی شان قدرت دکھلائی کہ دریا کو جاری فرما دیا اور اس کی پروا نہ نک نہیں کی کہ یہ کافر ہے میری ہمسر کا دعویدار ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ خدائی ہی اخلاق تھے جو دشمن کے ساتھ بھی ایسا معاملہ روا رکھا گیا دوسرا کوئی ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔

یہاں میں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ جب کافر کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ فرمایا تو اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی مومن موحد اور اللہ تعالیٰ کا ماننے والا خلوص کے ساتھ صدق دل سے حالت اضطرار میں اپنی کوئی حاجت طلب کر لیا تو کیا اللہ تعالیٰ اسے قبول نہ فرمائیں گے ضرور قبول کریں گے۔

دوستاں! کجا کئی محروم تو کہہ بادشمنال نظر داری
میں اپنے احباب کو وصیت کرتا ہوں کہ اس قصہ کو بار بار پڑھیں اور اسے
ذہن میں مستحضر کر لیں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر بھی
نظر ہو جائے گی اور انشاء اللہ تعالیٰ معرفت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی نصیب
ہو جائے گا۔

تاخیر اجابت کا سبب

آخر میں ایک ضروری بات بیان کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مومن اخلاص کے ساتھ دعا کرتا ہے اور بظاہر ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہیں ہو رہی ہے اس وقت ظاہر ہے کہ انسان اس
کی وجہ سے دل شکستہ ہو جاتا ہے پس اس تاخیر کا سبب مولانا دوم نے ثنوی
میں بہت ہی عمدہ بیان فرمایا ہے۔ ایسا کہ ہر مومن کو اس کے سننے کے بعد تو

بالکل تسلی اور اطمینان ہی ہو جاتا ہے ایک مقام پر یہ سرخی قائم فرمائی ہے کہ، سبب تاخیر اجابت دعائے مومن۔ اور اس کے تحت یہ فرمایا کہ:۔
 اے بسا مخلص کہ نالہ درد دعا دودا خلاصش برآید تا سماء
 بسا مخلص ایسے ہیں کہ اپنی دعائیں اس طرح سے نالہ و فریاد کرتے ہیں کہ ان کے
 اخلاص کا دھواں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔

تارود بالا لاتے ایں سقف بریں بوئے مجرا ز انین المذنبیں
 یہاں تک کہ گنہگاروں کی فریاد کرنے کی وجہ سے ان کے قلب کی انگلیٹھی کی خوشبو
 اس آسمان سے اوپر تک جاتی ہے۔

پس ملائک با خدا نالند زار کائے مجیب ہر دعا و مستجار
 یہ دیکھ کر فرشتے اللہ تعالیٰ سے رازدار نالہ کرتے ہیں کہ اے دعاؤں کی اجابت
 کرنے والے اور اے وہ ذات جس کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔

بندہ مومن تضرع می کند او نمی داند بجز تو مستند
 یہ مومن بندہ تجھ سے تضرع و زاری کر رہا ہے اور سوا آپ کے کسی اور کو تکیہ گاہ اور پناہ
 سہارا نہیں سمجھتا

تو عطا بیگانگان را می دہی از تو دارد آرزو ہر مشتری
 آپ تو بیگانوں کو بھی عطا فرماتے ہیں اور آپ سے تو ہر خواہشمند آرزو رکھتا ہے
 مومن مخلص کی دعا اور ملائکہ کی سفارش نقل کر کے مولانا روم رحمۃ
 اللہ علیہ آگے حق تعالیٰ کا جواب نقل فرماتے ہیں اور وہی سبب ہے تاخیر اجابت کا
 جو کہ مقصود بیان ہے فرماتے ہیں کہ سہ

حق بفرماید نہ از خواری اوست عین تاخیر عطایاری اوست
 حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری یہ تاخیر اجابت کچھ اس کی بے قدری کے سبب نہیں

بلکہ وہی تاخیر اس کے حق میں عین کرم ہے اور اس کی اعانت ہے۔
 نالہ مومن بھی داریم دوست گو تضرع کن کہ اس اعزاز و دست
 بات یہ ہے کہ مومن کی یہ آہ و فغاں ہم کو پسند ہے اس سے کہو کہ اور گریہ و زاری
 کرے کیونکہ اس میں اس کا اعزاز ہے
 حاجت آوردن ز غفلت سوتے من آں کشیدش موکشاں در کوئے من
 اس لئے کہ وہ غفلت میں پڑا ہوا تھا اس کی حاجت ہی اس کو میری طرف لائی اُسی
 نے اس کی چوٹی پکڑ کر میرے کوچہ میں اسے پہنچایا۔

گر برآرم حاجتش او وارود ہم در آں بازیم مستغرق شود
 اگر میں فوراً اس کی حاجت پوری کر دوں تو پھر اپنی پرانی حالت پر لوٹ جاویگا اور
 اسی سابقہ کھیل میں مشغول ہو جاوے گا۔

گرچہ می نالہ بجاں یا مستجاب دل شکستہ سینہ خستہ سو گوار
 خوش بھی آید مرا آواز او واں خدایا گفتق و آں راز او
 یہ جانتا ہوں کہ جان و دل سے نالہ کر رہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے دل اس کا شکستہ
 ہے سینہ خستہ ہے اور خود وہ غمزدہ ہے بایں دوائی میں جو اس کی دعا قبول نہیں
 کر رہا ہوں تو اس لئے کہ مجھے اس کی آواز ہی بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کا
 یا خدا یا خدا کہنا اور مجھے ہمارا بنانا پسند آتا ہے۔

زائچہ اندر لاپہ و در باجرا می فریباند بہر نوع مرا
 اور اس کی یہ بات بھی مجھے پسند ہے کہ وہ اپنے عرض مدعا میں طرح طرح سے
 تملق و چاپلوسی کر کے مجھے پھسلاتا ہے۔

طوطیان و بلبلاں را از پسند از خوش آوازی قفس در می کشد
 دیکھو! بلبل اور طوطی کو جو قفس میں بند کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنی خوش

آوازی کی دہرے سے لوگوں کو پسند ہوتی ہے۔

زاغ را و چغدر را اندر قفص کے کنتد ایں خود نیا مدد قصص
اور لاؤ اور کوٹے کے بائے میں کسی داستان میں یا کسی کی زبان سے نہ سنا ہوگا کہ کسی
نے انہیں بھی بجز بے میں پالا ہو۔

آگے مولانا رومؒ تاخیر اجابت مومن بوجہ پسندیدگی کی ایک مثال بیان
کرتے ہیں کہ:-

بیش شاپر باز چوں آید دو تن آں یکے کپیرو دیگر خوش ذقن
دیکھو کسی حسن پسند کے سامنے جب دو شخص آویں ایک تو ان میں بڑھیا ہوا اور
دوسری قبول صورت ہو۔

ہر دونان خواہند از زودتر فطیر آرد و کپیرو را کہ یکے
اور دونوں اس سے روٹی طلب کریں تو وہ جلدی سے روٹی لٹے گا اور بڑھیا کو
تو دے کر رخصت کر دے گا

واں دگر را کہ خوشستش قد و خد کے دہرناں بل بتا خیر افگند
اور اس دوسری کو جس کا قد اور خد خوبصورت ہے اور اس کو پسند ہے اس کو روٹی
دینے میں تاخیر کرے گا۔

گویشش بنشین زمانے بے گزند کہ بجاہ نان تازہ می پزند
یعنی اس سے کہیگا کہ آرام سے ذرا دیر بیٹھو گھر میں تازہ روٹی پک رہی ہے
پک جائے تو دوں۔

چوں رسد آں نان گرمش بعد کہ گویشش بنشین کہ حلوا می رسد
پھر جب بہت دیر کے بعد گرم روٹی لے آوے گا تو اس سے کہیگا کہ اچھا تھوڑی
دیر اور بیٹھ حلوا آتا ہے اس کے ساتھ کھانا۔

ہم بدیں فن دار دارش می کند وز رہ پنہاں شکارش می کند
غرض اسی تدبیر سے اس کو ذرا اور ٹھہرو ذرا اور ٹھہرو کہتا رہتا ہے اور مقصد پشیمانی
اس کو شکا کرنا ہوتا ہے۔

کہ مرا کار لیست بالو یک زمان منتظر می باش اے خوب جہاں
آخر میں کہتا ہے کہ مجھ کو تجھ سے ایک کام ہے مٹھوڑی دیر اور انتظار کر اے
حسین جہاں۔

تا مدیعت و رام گرداند و را تابدیں حیلت فریباند و را
اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بہانہ سے اس کو پھسلائے تاکہ اس کو اپنا مطیع
و مسخر کر لے۔

اس کے بعد مومنانے روم دعائے مومن میں بھی حق تعالیٰ کی تاخیر
اجابت کا اس مثال کے ساتھ انطباق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر
مشکل آں کمیہ راں بیگانہاں شاہد خوش روئے مثل مومناں
پس اسی بڑھیا کی طرح بیگانوں کو سمجھو کہ ان کو فوڑا دے کر دفع کر دیا جاتا ہے اور
شاہد خوشرو مثل مومنوں کے ہے جس کو دینے میں تاخیر کی جاتی ہے اور مقصود اس
کے جہاں کا دیکھنا ہوتا ہے

ایں جہاں زندان مومن زیں بود کافراں را جنت حالے شود
چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا سجن مومن کہلاتی ہے کہ اس کی حاجات کم پوری ہوتی
ہیں جس سے وہ تنگ بھی ہوتا ہے اور کافروں کے لئے جنت ہے کہ ان کی اکثر
حاجات مرضی کے موافق پوری ہوجاتی ہیں۔

بے مرادی مومناں از نیک و بد تو لقیں میداں کہ بہر ایں بود
حاصل کلام یہ کہ مومن خواہ نیک ہو یا بد وہ جو کبھی اپنی مراد کو نہیں پاتا تو یقین کر لو

کہ اس کی وجہ یہی ہے، یعنی اس کی گفتگو کا پسند ہونا، باقی حق تعالیٰ کی ناراضگی یا نیندے کی غواری ہرگز اس کا منشا نہیں ہے۔

سبحان اللہ کیساتلی بخش مضمون ہے اب اس کے دیکھنے کے بعد بجائے اس کے کہ تاخیر اجابت کی وجہ سے طبیعت ملول ہو حق تعالیٰ کے اس کرم اور عنایت پر نظر کر کے اور اس امر کا تصور کر کے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی دعا سننا چاہتے ہیں خدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے مال باپ سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم کو مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا ورنہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کو اس دار دنیا میں بھی بہت کچھ دیا ہے۔

(اللہ تعالیٰ ان صالحین کی برکات ہم سب کو نصیب فرمائے)

أَحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللَّهَ يُزِنِّي صَاحِبًا

اللَّهُمَّ أَنْتَ بَنِي أَفْضَلَ مَا تُؤْتِي عِبَادَكَ الصَّالِحِينَ

از مرتب

ضمیمہ نسبت صوفیہ

بسم الله الرحمن الرحيم

ولایت کا ثبوت تو خود کتاب و سنت سے ہے قال اللہ تعالیٰ
 اَلَا اِنَّ اَوْ لِيَاۤءِ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ه
 وقال اللہ تعالیٰ۔ وَاللّٰهُ وَكِيُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ لیکن یہ کہ اس کے مصداق
 کون لوگ ہیں؟ اور کون سی جماعت اس صفت کے ساتھ متصف ہے
 اس کو بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ولایت تو ایک باطنی چیز ہے
 اور جب باطنی چیز ہے تو اس کا مصداق متعین ہونا چاہئے ورنہ یا تو عام مومنین
 کو اس کا مصداق سمجھ لیا جائے گا یا کوئی مصداق ہی اس کا ذہن میں نہیں رہے گا
 اس کے متعلق اس وقت آپ کے سامنے حضرت مولانا قاضی شہداء اللہ
 صاحب پانی پتی رحمہ کے رسالہ ارشاد الطالبین سے ایک مضمون نقل کرتا ہوں
 جسکی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصداق حضرات صوفیہ ہیں (حضرت قاضی
 صاحب کی ہستی مشہور و معروف ہے آپ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے تلمیذ شریف
 اور حضرت مظہر جانجناں کے خلیفہ ہیں۔ محدث، مفسر، متکلم اور صوفی گزے
 ہیں۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ آپ کو بیہقی وقت فرمایا کرتے
 تھے، آپ فرماتے ہیں کہ:-

معلوم ہوا کہ کمالات ظاہری کے علاوہ
ایک کمال باطنی بھی ہوتا ہے اور اس
کے درجات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ
حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
ارشاد فرماتے ہیں کہ جو بندہ میری جانب
ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں اس کی سب
ایک گز قریب ہوتا ہوں اور جو شخص
میری طرف ایک گز قریب ہوتا ہے میں
اس کی جانب ایک باغ قریب ہوتا
ہوں اور ایک باغ ساڑھے تین گز
کا ہوتا ہے۔

اور فرمایا کہ بندہ ہمیشہ میری جانب عبادت
نافلہ کے ذریعہ قرب تلاش کرتا رہتا
ہے یہاں تک کہ میں بھی اس کو محبوب
بنالیتا ہوں اور جب اس کو محبوب
بنالیتا ہوں تو اس کی آنکھ کان اور
ہاتھ بن جاتا ہوں کہ میرے ہی ذریعے
اس کے سب کام انجام پاتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت قاضی صاحبؒ نہایت محکم دلیل اس پر قائم
فرماتے ہیں کہ حضرات مشایخ اس کمال باطنی کے حامل ہوتے ہیں چنانچہ
فرماتے ہیں کہ:-

پس معلوم شد کہ سوائے
کمالات ظاہری کمال است
باطنی کہ آل تفاوت درجات
بسیار دارد۔ چنانچہ حدیث
قدسی برآں دلالت می کند
کہ حق تعالیٰ می فرماید۔ ہر کہ
بمن یک وجہ نزدیکی جوید
من بویے یک گز نزدیکی جویم
وہر کہ بمن یک گز نزدیکی جوید
من بویے یک باغ کہ سڑ
ونیم گز باشد نزدیکی جویم۔

و فرماید کہ بندہ ہمیشہ
بمن نزدیکی می جوید بہ عبادت
نافلہ تا آنکہ من اور دوست
می دارم و چوں اور دوست
میدارم بینائی و شنوائی
و قدرت اور من می شوم

جماعتے بے نہایت کہ اتفاق شان
برکذب عقل محال می داند

بے شمار لوگوں کی ایک جماعت جس کے
جھوٹ پر متفق ہونے کو عقل محال سمجھتی
ہے بسبب ان کے بے نہایت ہونے کے
اور بسبب ان کے تمام اکناف عالم میں
منتشر ہونے کے یہ تو اتر کی طرف اشارہ
ہے کہ یہ تو اتر ہے اور بوجہ تو اتر کے اس کا
علم قطعی۔

وآں جماعتے بقسمے است کہ ہر ہر فرد
شان بسبب تقویٰ و علم بقسمے است
کہ تہمت کذب بردے روا نباشد
اور وہ جماعت اس قسم کی ہے کہ اس کا
ہر ہر فرد بسبب اپنے تقویٰ اور علم کے
ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ
کذب، کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے

(ف) یہ دلیل نقلی ہے کہ شرعاً ایسوں پر اتہام جائز نہیں۔ غرض ان دونوں دلیلوں
سے یہ مضمون ہم جس کو بیان کرنا چاہتے ہیں ثابت ہے۔

زبان قلم و قلم زبان خبر می دهند
کہ مار البیب صحبت مشایخ کہ
سلسلہ صحبت بر رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم میرسد در باطن حالتے
پیدا آمدہ سوائے عقائد
وفقہ کہ قبل از صحبت شان
بدال متحلی بودند و ازیں حالت
کہ حاصل شدہ محبت با خدا

ایسی جماعت زبان قلم اور قلم زبان
سے یعنی تحریر و تقریر یا خبر دیتی ہے کہ
ہم کہ مشایخ کی صحبت سے جن کا
سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
تک پہنچتا ہے، عقائد وفقہ کے سوا
جن سے وہ ان کی صحبت سے پیشتر بھی
بہرہ یاب تھے باطن میں ایک نئی
حالت پیدا ہو گئی ہے (جس سے وہ پہلے

و دوستانِ خدا و اعمالِ صالحہ آشنا بھی نہ تھے اور جس چیز سے آدمی آشنا تک نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کا انکار کر دے چنانچہ آجکل بکثرت طریقِ باطن کا جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں انکار ہو رہا ہے اور انکار کے بعد اس کے برکات کی خاصہ نصیب ہو سکتا ہے اور اسی حالت کے انکار سے جو حضرات اس کے حامل ہیں ان کا بھی انکار ہو رہا ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمالِ صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہو گئے۔

اس حالت کے یہ ثمرات و برکات ہیں۔ خدا کی محبت، دوستانِ خدا کی محبت، اعمالِ صالحہ کی محبت اور توفیق اور سابق اعتقادات میں رسوخ، کہ جس سے شکوک اور وساوس و اہسیہ کا جو درباب اعتقادات آیا کرتے ہیں قلع قمع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ یہ حضرات اکابرانِ لوگوں کو جو اس حالت سے منصف نہیں ہیں خشک کہتے ہیں جیسا کہ کتبِ تصوف سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اگے قاضی صاحب فرماتے ہیں۔

و ایں حالت کہ البتہ کمال است اور اس میں شک نہیں کہ یہ حالت خود بھی موجب کمال است۔ اور دیگر کمالات کے رجن کا بھی

ہم نے ذکر کیا ہے حصول کا ذریعہ بھی
 اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص اس حالت سے متصف ہو وہ کامل ہے
 اور اس کا فیض چونکہ دوسروں تک متعدی بھی ہوتا ہے لہذا وہ مکمل بھی کہلاتا ہے۔
 قاضی صاحب نے اس طرح سے جو اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اور اس
 ولایت کا اثبات فرمایا ہے تو یقیناً یہ الہامی مضمون ہے اور بلاشبہ اس سے ولایت
 کا اثبات ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہم سب کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور ان
 کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

جناب قاضی صاحب کا امت پر یہ احسان عظیم ہے کہ اتنی بڑی چیز جو مسلسل
 چلی آرہی تھی وہ منفقود ہو رہی تھی اور صرف فقر اور اعتقادات کو لوگ دین
 سمجھتے تھے جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے آپ نے اس کی جانب امت کو متوجہ
 فرمایا۔ یہ اہماء اور تجدد پرست قاضی صاحب کو دربار رسالت سے اسی خدمت
 کی وجہ سے کیا کچھ ملا ہوگا۔ میں حضرات علماء کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتا
 ہوں اور آج صوفیہ کی اسی نسبت سلسلہ کی جانب توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ہم
 ایک بڑی دولت سے محروم ہیں اور ایک بڑی سنت کے تارک ہو رہے ہیں۔
 قاضی صاحب نے اس بیان کے ذریعہ علماء اور صوفیہ کے ایک قدیمی نزاع
 ہی کو ختم کر دیا ورنہ تو بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے باہم ان دونوں جماعتوں کے
 مابین ایک خلیج نزاع کی حامل ہو گئی تھی۔ قاضی صاحب نے تو اترا اس کو ثابت
 فرمایا کہ علماء ربانی نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ مشائخ کی صحبت سے ہم
 نے اپنے باطن میں ایک نئی کیفیت محسوس کی ہے جس نے ہمارے سابق علوم و
 اعمال میں ایک روح ڈال دی ورنہ اس سے پہلے ہمارے اعمال حال سے اور
 ہمارے جملہ مشاغل کیف سے خالی تھے اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ کے پاس

کوئی دولت ہے جس سے علماء بھی مستغنی نہیں ہیں اور ہر زمانہ میں اس کے طالب ہوتے ہیں۔

اور اس میں شک نہیں کہ علماء اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم ظاہری کے حامل ہیں تو صوفیائے کرام بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کے وارث ہیں، جیسا کہ بی قاضی صاحبؒ اپنے ایک دوسرے رسالہ ”مالا بدمنہ“ میں فرماتے ہیں کہ۔

بدان اسعدک اللہ تعالیٰ اسی ہمہ کہ
گفتہ شد صورت ایمان واسلام
وشریعت است و مغیر و حقیقت
اور در خدمت درویشاں باید حقیقت
و خیال نہ باید کرد کہ حقیقت
غلاف شریعت است کہ ایں
سخن جہل و کفر است ۔
(مالا بدمنہ)

جانو! اللہ تعالیٰ تم کو نیک بخت بنائے
کہ یہ بیان جو گذرایہ تو ایمان واسلام اور
شریعت کی ظاہری صورت تھی باقی اس
کا مغیر اور حقیقت درویشوں کی خدمت
میں تلاش کرنا چاہئے اور یہ ہرگز نہ سمجھنا
چاہئے کہ حقیقت شریعت کے خلاف
(یعنی مقابل) کوئی چیز ہے کیونکہ ایسی بات
زبان سے نکالنا جہالت بلکہ کفر ہے۔

پھر ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ۔
نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
از سینہ درویشاں باید جست و
بدان نور سینہ خود را روشن
باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ
در یافت شود۔
(مالا بدمنہ)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو زیرِ گو
کے سینہ سے حاصل کرنا چاہئے اور اس
نور سے اپنے سینہ کو روشن اور منور کرنا چاہئے
تاکہ ہر خیر اور شر فراست صحیحہ کے ذریعہ
معلوم ہو سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نورِ باطن (یعنی نسبتہ اور سکینہ) کے حامل ہی حضرات ہوتے ہیں اور جیسا کہ قاضی صاحب نے فرمایا ہے اس کی وجہ سے ان کے اندر فراست اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب سے بہت سی چیزیں جو دوسروں پر مخفی ہوتی ہیں ان حضرات پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔

یہی مطلب ہے اس حدیث شریف کا کہ **اَتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ**۔ یعنی مؤمن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے چنانچہ حاشیہ ”مالا بد منہ“ میں حضرت خواجہ عبدالحق غجدوانیؒ کا اس پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ:-

”ایک شخص درویشوں کا ساجتہ دستار پہنے ہوئے حضرت کی مجلس میں آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا جب حضرت خواجہ اپنے پسند و ناصیح سے فارغ ہوئے تو وہ شخص کھڑا ہو گیا اور کہا کہ حضرت **”اَتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ“** کا کیا مطلب ہے؟ اور اس فراست کا فراموش نہ دیکھنا چاہتا ہوں“

فرمایا کہ وہ فراست یہی ہے کہ تم اپنی زُتار توڑ دو۔ یہ سن کر وہ چلایا کہ معاذ اللہ زُتار سے مجھے کیا سروکار۔ حضرت کا اشدہ پا کر ایک مرید نے بڑھ کر اس کی ربائی گڈڑی کو الٹ دیا تو اس کے نیچے سے زُتار نکلی۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ یارو! آؤ ہم سب بھی اپنے باطنی زُتار کو توڑ کر اللہ تعالیٰ سے نیا عہد باندھیں۔ اس پر مجمع سے ایک شور اٹھا اور سب نے تجدید بیعت کی۔ سبحان اللہ!

(حاشیہ مالا بد منہ)

دیکھا آپ نے یہ تھا نور جو اللہ تعالیٰ اپنے مقبولین کو عطا فرماتے ہیں
 بزرگوں نے اس نور اور نسبت سے کیا کیا کام لئے ہیں اس سلسلہ کے
 واقعات سے کتا ہیں پڑھیں چنانچہ مجھے اس واقعہ پر حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب
 گنج مراد آبادی رح کا ایک واقعہ نہیں بھولتا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب و غریب
 واقعہ ہے اسی نور باطن سے متعلق۔ اس واقعہ کے سننے کے بعد حضرت شاہ صاحب
 سے عقیدت و محبت بہت زیادہ ہو گئی۔ آپ بھی سنئے اور ایمان تازہ کیجئے۔
 را، ایک شخص نے کسی آریہ کی کتاب دیکھی جس میں اس نے اسلام پر اعتراضات
 کئے تھے اس کے قلب میں بھی اس کے اعتراض کرنے سے شبہ پیدا ہو گیا۔

اسلام سے بد عقیدہ ہو گیا۔ رمضان شریف کا زمانہ تھا روزہ رکھے ہوئے تھا
 مگر خیال کیا کہ جب اسلام ہی ٹھیک نہیں ہے (معاذ اللہ) تو پھر اس کے
 احکام پر عمل کیسا؟ یہ کہہ کر روزہ توڑ دیا۔ شام کو اپنے ایک دوست کے
 گھر اس سے ملنے گیا افطار کا وقت قریب تھا وہ افطاری وغیرہ سامنے
 رکھے ہوئے تیار ہی بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ آؤ
 بھائی انوب آتے آؤ آج ہمارے ساتھ افطار کرو،

اس نے جواب دیا کہ افطار کیا کریں۔ اگر میرا حال تم کو معلوم ہو جائے
 تو تم مجھ سے بات کرنا اور مجھ کو پاس بٹھانا تک گوارا نہ کرو۔ وہ شخص سمجھا
 تھا سمجھ گیا کہ کسی بد عقیدگی میں مبتلا ہو گیا ہے اس نے کہا کہ بیش از بیش
 یہی ناکہ تم کافر ہو گئے ہو گے تو بھائی ایمان اور کفر کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ
 ہے، ہماری تمہاری تو دوستی ہے اس لئے آؤ اور ہمارے ساتھ افطار

میں شریک ہو جاؤ، اور دوسرا کام یہ کہہ کر صبح ہی حضرت مولانا شاہ فضل
 الرحمن صاحب کی خدمت میں گنج مراد آباد آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کی

ہدایت کا وقت آگیا تھا بات سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ اگلے روز سویرے ہی گنج مراد آباد روانہ ہو گیا۔ خانقاہ میں پہنچا۔ حضرت کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی بس اتنی جگہ سے کود کر اس کی جانب پھپھے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منکشف ہو گیا تھا کہ ایک شخص بگڑ گیا ہے اور آپ کے پاس جا رہا ہے اس کو ٹھیک کیجئے) اور اس کے سینہ پر بڑی زور سے ہاتھ مار مار کر فرمانے لگے کہ بتلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہ ہے۔ بتلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہ ہے یعنی اس کو کچھ کہنے اور سننے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بلکہ ان خود اس سے پوچھنے لگے۔ اب جو وہ اپنے اندر غور کرتا ہے تو شبہ کے ساتھ ساتھ قلب میں اس کا جواب بھی موجود۔

چنانچہ اسلام کی جانب سے سینہ بالکل صاف ہو گیا اور اس کی حقانیت پر شرح صدر ہو گیا۔ پھر حضرت ہی کے ہاتھ پر اس نے توبہ کی اور نہایت پاک صاف سینہ والا ہو گیا اور اس کے بعد سے نایات کبھی اس کے دل میں اسلام کے کسی مسئلہ کے متعلق ذرا بھی دسوسہ نہیں پیدا ہوا۔

سبحان اللہ کیسا سینہ تھا اور کیا نور تھا۔ یہ ہے بزرگوں کا فیض اللہ ان کی تاثیر محبت جس سے یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے تعلق اور ان سے نسبتہ صحیح پیدا کرنے کی بدولت نوازے جاتے ہیں۔

اسی قلبی نور اور فراست پر ایک اور واقعہ سنئے :-

(۲) ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت چاند شاہ صاحب بڑے صاحب کشف اور روشن ضمیر بزرگ ہوئے ہیں ایک شخص ان کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے آیا۔ اپنے باغ سے کچھ کچھ آم ہدیہ کیلئے ہمراہ لایا راستہ میں ایک دخت کے نیچے ایک بڑا سا آم پڑا تھا اس نے اس کو بھی اٹھا کر جھولے میں ڈال لیا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ کر وہ ہدیہ پیش کیا حضرت نے

اسی وقت جھوٹے کو الٹا اور اس بڑے والے آم کو لے کر اس سے کہا کہ -
 میٹھاری ٹھوہم ہی کا دے کے رہا (یعنی اس قسم کے حرام مال دینے کے لئے ہمارا
 ہی انتخاب تم نے کیا، یہ کہہ کر اس کے سب آم واپس کر دیئے اور فرمایا جاؤ
 تمہارا ہدیہ نہ لیں گے۔

۳۳) انہیں بزرگ کا ایک اور واقعہ ہے کہ اسی طرح سے ایک شخص مرید ہو
 کی نیت سے آیا اور جیسا کہ دیہاتوں کی عادت ہوتی ہے دوسرے کے
 کھیت سے گنا توڑ کر چستا ہوا چلا آیا حضرت کی خدمت میں جب ملاقات
 کے لئے آیا تو فرمایا کہ بھیا کیسے آیتو اس نے عرض کیا کہ مرید ہونے کے لئے
 فرمایا کہ اور راستہ میں ا دکھیا کا ہے توڑے رہو۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ جاؤ تم کو
 مرید نہ کریں گے۔

یہ سب واقعات مشائخ کے میں اس پر سنارہا ہوں کہ ان حضرات
 کے خلوص کی برکت سے اللہ تعالیٰ شانہ ان کو کوئی دولت بخشتا ہے اور
 ان کے قلوب میں نور ہوتا ہے اور یہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کی باطنی سلطنت کے وارث ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر زمانہ میں علماء ربانی
 نے ان کی قدر کی اور جب کسی کو پہچان لیا ہے تو پھر اس کے اپنے کو فناء ہی
 کر دیا ہے۔

یہ ضرور ہوا کہ مشائخ کا لوگوں نے انکار بھی کیا ہے لیکن علماء
 نے جب کسی مانا ہے تو اس میں شک نہیں کہ پھر ان سے زیادہ بزرگوں کو کسے
 مانا بھی نہیں ہے۔

حضرت سید احمد رفائیؒ بھی اپنے زمانہ میں علماء ظاہر کو جماعت
 صوفیہ کی جانب ہنایت موثر عنوان سے متوجہ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

عسز من ! ان غریب علماء سے بھی جو حجاب میں پڑے ہوئے ہیں
پوچھو ! کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے شہروں میں کوئی ایسا شخص ہے
جو زبردست کرامتوں سے منکروں، گمراہوں (اسلام کے مخالفوں) معاندوں
کو دبا دے اور مغلوب کر دے جن کو دیکھ کر مخالفین اسلام خود ہی بول اٹھیں
کہ واقعی اسلام سچا مذہب ہے، بحث و تکرار کی نوبت ہی نہ آئے۔

کیا تمہارا دل یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی زبان
کا سلسلہ بند ہو جائے تمہارے نفس یہ خواہش کرتے ہیں کہ معجزات نبویہ
کی سلطنت جاتی ہے (اگر تمہاری ہی تمنا ہے تو اپنے ایمان کی خیر مناد)
اگر نہیں تو بتلاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی ترجمان کون ہے؟
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا نمونہ کس کے پاس ہے؟ تمہارے
پاس ہے یا سو فیہ کے؟ اگر یہ لوگ نہ ہے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ
وسلم کے روحانی اور باطنی کمالات کا نمونہ دنیا کو کون دکھلائے گا؟

(البنیان المشید ص ۱۶)

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کا تعلق ایسا نہیں ہے کہ
مومن اس سے صبر کر سکے۔

الصبر یجحد فی المواطن کلھا الا علیک فانہ مذموم
اسی لئے اللہ تعالیٰ سے نسبت صحیحہ ہر زمانہ میں ایک جماعت نے پیدا
کی ہے اور بعد والوں کو ترغیب دے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ نسبت وہ ہے
جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے اب تک چلی آرہی ہے
انبیاء علیہم السلام سے لے کر اولیاء کرام تک سب اس کے حامل ہے
ہیں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور نہ لوگ اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں

چنانچہ حضرات اہل اللہ نے اس کو سمجھا اور اس کی تحصیل کے لئے
کھربانڈھلی اور جان کی بازی لگا دی اسی کو کسی اہل دل نے خوب کہا ہے

میں بھی اس پر مر مٹا نا صح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی
اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کے عشق کو
قلب میں پیوست کرنے والا یہ مضمون ہے۔